
شاہکار



ہندوستان کو اپنے طالب علموں پر بڑا فخر ہے۔ وہ جانتے ہیں مُلک ایک آزمائش سے گزُر رہا ہے۔ اِس آزمائش میں جو فرض ان پر واجب ہے، اُسے ادا کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ نیشنل کیڈٹ کور میں بھرتی ہو کر، اپنا خُون دیکر، شہری بچاؤ کے کام میں ہاتھ بٹا کر اور چندہ اکٹھا کر کے وہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی پڑھائی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں پڑھائی پُوری کر کے وہ مُلک کے اندر زیادہ کام آسکیں گے۔ ہمارے طالب علم مُلک کی خدمت میں جُٹے ہوئے ہیں۔

سوچیں تو! آپ مُلک کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

ایک عظیم مُلک ہمارا
ایک عظیم قوم

ترتیب

• مضمون

• غزلیں

• طنز و مزاح

ممتاز الحق پرنٹر و پبلشر نے اسرار کریمی پریس الہ آباد میں چھپوا کر دفتر "شاہکار"
ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد سے شائع کیا۔

اپنی بات

۱۹۶۵ء ہمارے لئے اچھا سال ثابت نہ ہوا تھا کیونکہ اس سال ہمیں اپنے ہمسایہ ملک کی جارحیت کے خلاف جنگ کرنی پڑی جس میں دونوں طرف کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنگ تو رک گئی لیکن امن کی فضا نہ پیدا ہو سکی تھی اور دونوں ملکوں میں عام بیچینی برقرار تھی لیکن کون جانتا تھا کہ ۱۹۶۶ء بھی ہمارے لئے منحوس ثابت ہوگا۔

ہم نے نئے سال کا بڑی خوشیوں اور اُمیدوں سے استقبال کیا تھا کہ یہ سال اپنے ساتھ امن کا پیغام لایا تھا۔ وزیر اعظم روس کی مخلصانہ کوششوں سے دونوں ملکوں کے سربراہ تاشقند میں جمع ہوئے اور کھلے دل سے باتیں کرنے کے بعد اُس معاہدۂ امن پر دستخط کر دیئے جو معاہدۂ تاشقند کے نام سے تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

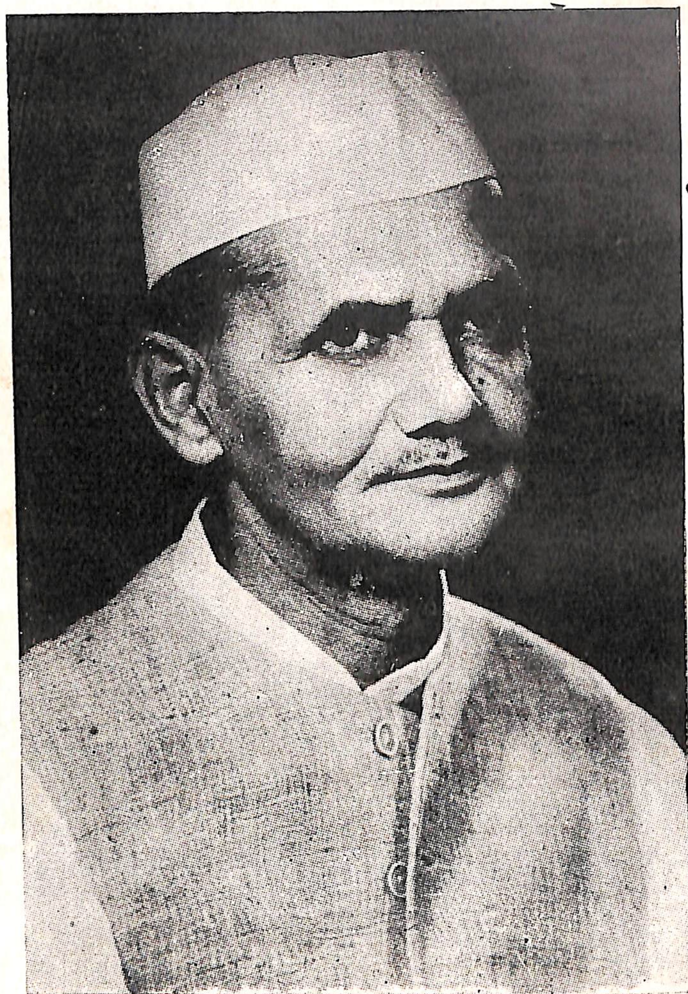
لیکن افسوس کہ ابھی اس معاہدہ کی روشنائی خشک بھی نہ ہو پائی تھی کہ موت کے بیرحم ہاتھوں نے ہمارے وزیر اعظم کو ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کی وفات کے بعد جب شری لعل بہادر شاستری نے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت ملک اور بیرون ملک میں اکثر لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ وہ پنڈت جی کی طرح کامیابی سے ملک کی رہنمائی نہ کر سکیں گے۔ لیکن جن لوگوں نے ان کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کیا تھا انھیں شاستری جی کی ایمانداری، خلوص، مستعدی، تدبر اور قابلیت پر پورا اعتماد تھا کہ انھیں اوصاف کی بدولت وہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہو کر ترقی کی اس معراج تک پہنچے تھے۔ اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ اُن کا اعتماد بجا تھا۔ ہند نیپال کے تعلقات کی اصلاح، موئے مبارک کی تحریک اور جنوبی ہند میں زبان کو لیکر ہونے والے فسادات پر قابو پانا شاستری جی کے معمولی کارنامے نہیں۔ پھر جب ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوا اُس وقت بھی شاستری جی نے پورے جوش اور ہوش کے ساتھ ملک کی قیادت کی لیکن ان سب سے بڑا کارنامہ تھا معاہدۂ تاشقند جس نے انھیں امر بنا دیا۔

ہماری نئی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی اعلان کر چکی ہیں کہ حکومت ہند معاہدۂ تاشقند کا پورا احترام کرے گی اور اس پر پورے خلوص کے ساتھ عملدرآمد ہوگا۔

اور ہمارے خیال میں شاستری جی کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم بھی اُسی راہ پر چلنے کا عہد کریں جو گاندھی جی کو پسند تھا، نہرو جی کو پسند تھا اور شاستری جی کو پسند تھا یعنی آزادی، سوشلزم، سیکیولرزم، قومی یکجہتی اور امن کا راستہ!

محمود احمد ہُنر



کرشن موہن

کھو گیا اک بیش بہادر

شری لال بہادر شاستری کی
کی اچانک وفات پر

کون بتائے، کس سے پوچھیں
کچھ نہیں آتا، اپنی سمجھ میں
خالق اپنے شہکاروں کو
کیوں بے وقت مٹا دیتا ہے
اکثر یہ محسوس ہوا ہے
وہ تو اک ضدی بچہ ہے
اور ہم سب ہیں اُس کے کھلونے
جس کو جب بھی چاہے، توڑے

آج پھر اُس ضدی بچے نے
اپنا اک پُر نور کھلونا
آہ اچانک توڑ دیا ہے

آج پھر اس بزم ہستی سے
ایک ایسا انسان گیا ہے
جس کا ہم سب کی نظروں میں
مان بڑا، احسان بڑا ہے

چمکیلا کردار تھا جس کا
گرویدہ سنسار تھا جس کا
لعل تھا اپنا لال بہادر
اندھیارے میں راہنما دُر
کھو گیا اک بیش بہادُر
بھارت کے گوشے گوشے میں
لہر اَلم کی دوڑ گئی ہے
سچ تو یہ ہے ساری دھرتی
صرف کرب و درد ہوئی ہے
چھوڑ گیا ہے اپنے غم میں
سارے عالم کو ماتم میں

محسن اعظم دارِ فنا سے
اپنا رشتہ توڑ گیا ہے
عہد امن مکمل کر کے
صدقے اس کے قلب و نظر کے
زندہ ہے وہ بے شک مر کے

جسم تھا فانی، چھوڑ گیا وہ
دنیا سے منہ موڑ گیا وہ
لیکن اس کا نام امر ہے
کام امر پیغام امر ہے

جیلانی بانو

کسبی

نیکما، تم بوڑھی کیسے ہو گئیں ——— ؟

آج مجھ سے راجہ نے پوچھا۔

اپنے کمرے میں اکیلی پڑے پڑے میں سوچ رہی ہوں کہ میں اتنی بوڑھی کیسے ہو گئی؟ میری جوانی دبے پاؤں کب سرک گئی۔ بڑھاپا کیسے قریب آیا ——! مجھے تو کچھ یاد نہیں آتا۔

باہر زوروں کا مینہ برس رہا ہے۔ میرے پڑوس میں رہنے والی لڑکی کھڑکی میں کھڑی بڑی اداسی کے ساتھ گنگنا رہی ہے ——— میں نے لاکھوں کے بول سہے سنوریا تیرے لئے تھوڑے دنوں کے بعد اس لڑکی کو پتہ چلے گا کہ صرف لاکھوں کے بول ہی نہیں سہنا پڑتے بلکہ ان گنت دکھ بھی اٹھانا پڑتے ہیں۔ اس سنوریا کے لئے جو کبھی ہمارا نہیں ہوتا۔

گھر میں کتنا شور ہو رہا ہے۔ بال کرشنا اور کٹی کے بچے چلا رہے ہیں۔ کٹی کی بہو دفتا اپنے پتی سے لڑ رہی ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ جس وقت وہ دفتا کی ہنس ہنس کر خوشامد کرے گا تو دفتا اپنا سب غم بھول جائے گی۔ دنیا کا ہر سکھ اسے حقیر دکھائی دے گا۔ دنیا کی ہر خوش قسمت عورت اپنے سے کم نظر آئے گی۔ جانے بھگوان نے ہمارے دماغوں میں یہ چیز کیوں بھر دی ہے۔ ہمیں اس بات پر کتنا غرور ہے کہ ہم اپنے پتی کا غرور ہیں۔ اپنے بیٹوں کی راہنما ہیں۔ سب شاستروں میں یہی لکھا ہے۔ کیا مجال کہ کوئی عورت اس حد کو پھلانگ سکے۔ اور جس نے ایسی ہمت کی وہ رنڈی کہلائی۔ عورت کا سب سے شرمناک روپ۔ لوگ ان عورتوں پر ترس کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں ان کی ماؤں، نانیوں پر جو برا وقت پڑا تھا اسے بھول جاؤ۔ ان پر رحم کرو۔ اور انھیں اپنے گھروں میں قید کر کے انکے

قصور معاف کرو ــــــ کیوں ــــــ ؟ کیوں معاف کرو ــــــ تاکہ وہ ستی ساوتری بن کر زندگی کے نرک میں جلتی رہیں ؟

ایسی باتیں سوچ کر میں لرز جاتی ہوں۔ جانے کیوں میرا پاپی من ہمیشہ ایسی اوندھی سیدھی باتیں سوچا کرتا ہے۔ اب تو میں اپنی ارتھی تھامے بیٹھی ہوں۔ ساٹھ برس کی بڑھیا ــــــ مجھے تو اپنی زندگی پر بڑا مان کرنا چاہئے۔ اپنے ایثار اور قربانیوں پر۔ مگر جانے کیوں اب مرتے سمے، آج مدتوں بعد مجھے راجا پھر نظر آگئی۔ اس نے میرے من کو پھر گندہ کر دیا۔ آج مجھے بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں۔

مینہ کتنا تیز ہو گیا ہے ــــــ بچّے آج اسکول جانے کی بجائے گھر میں شور مچا رہے ہیں۔ کہتے ہیں زور کا مینہ برس رہا ہو تو ٹوٹے پریم کے رشتے یاد آتے ہیں۔ یاد آتے ہوں گے۔ مجھے تو کبھی یہ معلوم ہوا کہ پریم کیا چیز ہے۔ کیسے انسان ایک صورت کو یاد کئے جاتا ہے۔ کسی کو اپنی جان اپنی زندگی سمجھنے لگتا ہے۔ سب کہانیوں میں کویتاؤں میں یہی بات دہرائی جاتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ مجھے کوئی صورت یاد کیوں نہ رہی ؟ کوئی تو ہوتا جس پر آج مرتے سمے، مان کر سکتی کہ اس نے مجھے چاہا۔ سنسار کی ہر چیز سے زیادہ مجھے پیار کیا ــــــ مگر ہمارے آندھرا پردیش میں ماؤں کو یہ بڑا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی بیٹی ماں باپ کے گھر جوان نہ ہو۔ کہیں میکے سے وداع ہوتے وقت اس کے دل میں کوئی ایسی صورت نہ بیٹھ جائے پھر کبھی نہ بھلائی جا سکے۔ میرے ماں باپ نے بھی ایسی ہی جلدی مچائی تھی۔ اسی لئے تو چاہے کیسی ہی برسات آئے مگر میرے سونے دل میں کوئی ہوک نہیں اٹھتی۔

میں اپنا میکہ یاد کرنے لگتی ہوں۔ جب سے گاؤں چھوڑ کر میں ان کے ساتھ شہر آئی ہوں، مجھے برسات میں اپنا میکہ بہت یاد آتا ہے۔ شہر والوں کے لئے تو برسات ایک مصیبت ہے۔ برسات کی قدر ان گاؤں والوں سے پوچھو جو زندگی کا ہر داؤ اچھی فصلوں پر لگا دیتے ہیں۔

میرے میکے کا گھر کتنا بڑا تھا ــــــ ! پورے گاؤں میں اس سے اونچا گھر اور کوئی نہ تھا۔ مگر جب ملشیم چاچا گاؤں میں ایک کسبی راجا لائے تو انھوں نے ہمارے گھر کے سامنے ہی بہت اونچا مکان بنوایا۔ اتنا بڑا کہ سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ میرے چاچا بہت پیسے والے تھے۔ ان کے

پاس بہت سے تاڑ کے باغ تھے کھیت تھے۔ بیل تھے۔ اس لئے گاؤں کے بوجھ بجھکڑ بھی ان سے صاف صاف کچھ نہ کہہ سکے۔ اور وہ بڑے نڈر بن کر چار بچوں والی بیوی کو گھر میں چھوڑ کر اس کسبی کے ہاں جا پڑے۔

میں اس وقت گیارہ بارہ برس کی ہوں گی۔ جب ایسی عمر تھی کہ کبھی کے نام پر سارے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی تھی۔ اور اپنے دولہا کے ذکر پر جانے کیوں سارے بدن کا خون کھنچ کر گالوں پر اکٹھا ہو جاتا تھا۔

ریڈی خاندانوں میں کوئی اتنی سیانی بیٹی کو گھر میں نہیں بٹھاتا۔ مگر میرے نائینا (باپ) بھی کیا کرتے! اس سے پہلے وہ بیس بیس ہزار دے کر دو بیٹیوں کے دولہوں کا مول کر چکے تھے۔ میرے لئے ایک اچھا سا دولہا خریدنے کیلئے پیسہ جمع ہو رہا تھا۔ اسی فکر میں روز نائینا اور ماں دیول جا کر دعائیں مانگتے تھے کہ فصلیں اچھی ہوں تاکہ میرا بیاہ ہو سکے۔ میں ان سے دور گھر میں بیٹھی چاول صاف کرتی تھی۔ مگر میرا من بھی بھگوان سے یہی بات کہے جاتا۔ جانے کیوں مجھے اپنے بیاہ کا بڑا ارمان تھا۔ بڑی جلدی تھی۔ شاید میں اتنی جلدی نہ مچاتی، اگر ماں مجھے پڑھنے کے بہانے بار بار کوٹھے پر نہ بھیجا کرتی۔ میں ہزار باتیں سمجھنے پر بھی یہ بات سمجھنے کی کوشش نہ کرتی کہ جب نائینا آتے ہیں تو ماں یہ کیوں چاہتی ہے کہ اب میں ان کے کمرے میں نہ آؤں۔

اور کوئی کیا جانے کہ کوٹھے پر پڑھنے پڑھتے میں کیا کیا دیکھا کرتی تھی ملیشم چاچا کا مکان بالکل سامنے تھا۔ ہمارے کوٹھے کے سامنے والے کمرے میں وہ دونوں رہتے تھے۔ وہاں سے چاچا اور راجا کے چوچلے دیکھ کر میں لوہے کی طرح تپنے لگتی تھی۔ یوں لگتا جیسے مجھے ذرا سا بھی دھکا لگا تو میں چٹاخ سے پھٹ جاؤں گی۔

پھر کتاب کو ایک طرف ڈال کر میں اپنے دولہا کے انتظار میں کھو جاتی۔ دل ہی دل میں راجا کی طرح بننے سنورنے کے ہزاروں منصوبے بنا لئے تھے۔ میں نے تو ساریوں کے رنگ تک ویسے ہی سوچ رکھے تھے جیسی ساریاں راجا پہنا کرتی تھی۔ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ دن بھر ہنسے جاتی گنگنائے جاتی۔ میں نے اپنے گھر میں کسی عورت کو کبھی اتنا ہنستے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ میری بہنیں بھی سسرال جاتیں

تو سسکتی ہوئی۔ لوٹ کر آتیں تو آنکھیں پونچھتی ہوئی۔ ایسا لگتا کہ بیچاریوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ آخر گھروں میں رہنے والی شریف عورتیں ہنسنا کیوں نہیں جانتیں؟ ایک بار میں نے ماں سے یہ بات پوچھنا چاہی پر ٹال گئی۔ کیونکہ ایسے سوالوں پر وہ ہمیشہ غصہ بھری نظروں سے مجھے گھورتیں اور کوئی ایسا محنت طلب کام میرے حوالے کر دیتی تھیں کہ ایسی فضول باتیں فوراً میرے دماغ سے نکل بھاگتیں۔

اور پھر اپنے آس پاس چور نظروں سے دیکھ کر میں وہ منظر یاد کرنے لگتی تھی جب بلیشم چاچا اپنے ہاتھ سے راجا کو کچھ کھلا رہے تھے۔ ایک بار انھوں نے راجا کے جوڑے میں بینی سجائی تھی۔ میں ہزاروں من کی وزنی ہو کر نیچے اترتی تو مجھے سندرّا چاچی کی وہ بات یاد آتی تھی —— "جوانی میں عیش کر لیں حرام خوریں۔ بڑھاپے میں مکھیاں بھنک جاتی ہیں۔ مرتے وقت کوئی اپنا سرہانے نہیں ہوتا۔" سندرّا چاچی چار بچوں کو لئے اکیلی گھر میں پڑی رہتی تھیں۔ دن رات چولھے چکی میں لگی ہوئی، بھینسوں کا دودھ دوھ رہی ہیں۔ آنگن میں گوبر کا چھڑکاؤ کر کے چونے کی لکیروں سے رنگولی بنا رہی ہیں۔ بچوں کو نہلا رہی ہیں۔

ماں کہتی تھیں کہ جب سندرّا چاچی بیاہ کر آئی تھیں تو ان سے زیادہ سندر لڑکی پورے گاؤں میں اور کوئی نہ تھی۔ ان کے سوکھے مرجھائے چہرے کو غور سے دیکھ کر میں سوچتی تھی کہ کہیں بلیشم چاچا نے سندرّا چاچی بدل تو نہیں دیں؟ شاید چاچا کو ایسا کوئی جادو آتا ہو کہ اچھی بھلی چاچی کو راتوں رات اتنا بدصورت بنا دیا۔ اور اس چڑیل راجا کو اپسرا کر دیا ہے۔ راجا سچ سچ اپسرا لگتی تھی۔ میں نے اتنی خوبصورت، اتنی ہنس مکھ عورت پھر کبھی نہ دیکھی۔ (ویسے ہنس مکھ عورتیں تو شاید دنیا میں ہوتی ہی نہیں)۔

مجھے اس دن کا کتنا انتظار تھا جب ایک دن میں راجا کے ہاتھ میں بھیک کا ٹکڑا دیکھوں گی۔ وہ گندی بیماریوں میں سڑتی ہوئی ایک بڑھیا ہو گی۔ اور جب میرے آگے ہاتھ پھیلائے گی تو میں کہوں گی —— پہلے کیوں نہ سوچا تھا۔ کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ میری چاچی کو رُلا کر ساری زندگی یوں ہی ہنستی رہو گی۔؟

یوں ہی ہنستی رہو گی۔؟

ایک بار ماں نے راجا کو دور سے دیکھا تو کہا تھا —— "کمبخت اچھی بھلی ہے۔ مگر نصیبوں جلی کی کیسی مٹی پلید ہو رہی ہے!"

ماں کی بات سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا تھا۔ اب میں ان سے کیسے کہتی کہ ذرا کوٹھے پر چل کر دیکھو اگر راجا کی آج کل مٹی پلید ہو رہی ہے تو سکھ کس چیز کا نام ہے۔؟ پھر میں چاچی کی دلجوئی میں لگ جاتی تھی۔

اس بات کے کئی دن بعد میں نے سامنے کوٹھے پر دیکھا تو جیسے اچانک دھنک سی پھوٹ پڑی تھی۔ راجا بنی سنوری ایسے پیارے روپ میں کھڑی تھی کہ دس نگر دور سے بھی اس پر مرمٹے۔ میں نے اس کے لئے اپنے دل میں جو نفرت جمع کی تھی وہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ ہمارے گاؤں کے نوکروں نے بھی رنڈی کے ہاں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے نوکر بھی اپنے ساتھ ہی لائی تھی۔ گاؤں کا کوئی آدمی اس کے گھر نہیں جاتا تھا۔ مگر آج اچانک اسے یوں تنہا دیکھ کر مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ پھر اس نے اشارے سے مجھے بلایا کہ میں اس کے پاس آجاؤں مجھے جیسے دنیا کی سب سے بڑی دولت مل گئی۔ اسے قریب سے دیکھنے اور چھونے کی خواہش میں جانے کب سے دل میں دبائے بیٹھی تھی، میں تیزی سے نیچے بھاگی، جہاں چولہے کے پاس ماں بیٹھی سندر چاچی کے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

"ماں —— وہ راجا ہے نا —— وہ مجھے —— "

"چپ —— چپ ——" ماں نے اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ میں اور کچھ نہ کہہ سکی —— "کہیں کنواریاں رنڈیوں کا نام لیتی ہیں۔ تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی جو تو نے پھر کبھی راجا کو دیکھا۔ چل جلدی سے چولہا سلگا۔"

میں سہم کر دیوار سے چمٹ گئی۔ اور جانے کیوں اچانک مجھے احساس ہوا کہ ماں نے مجھے پاپ کے گڑھے میں گرنے سے بچا لیا ہے۔ اگر کہیں میں راجا کے ہاں چلی جاتی تو —— ؟ وہ مجھے چھو لیتی تو —— ؟ میں جو کنول کی کلی کی طرح پاک ہوں۔ راجا سے بہت بلند ہوں۔ چاہے میرے من

میں کیسی ہی گندی گندی باتیں آتی ہوں۔ کسی کو کیا معلوم! "اری سندرتا صبر کر بہن۔ بھگوان پاپ کی سزا ضرور دیتے ہیں۔" ماں سندرا چاچی کو سمجھا رہی تھی۔

"بھابی یہ چڑیلیں کچھ دوا کھلا دیتی ہیں کہ آدمی اپنی سدھ بدھ کھو کر انھیں کا دیوانہ بن جاتا ہے!" چاچی نے آنسو پونچھ کر کہا۔ میں نے سوچا کہ چاچی اپنے پتی کو قصوروار کیوں نہیں ٹھہراتیں! راجا کے پاس دیوانہ بنانے کی جو دوا ہے وہ چاچی کو کیوں نہیں مل سکتی!

میں یہ بات آگے بڑھ کر پھر ماں سے پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر ان کا غصہ یاد کر کے پیچھے ہٹ گئی۔

"ارے بھگوان کے باندھے ہوئے بندھن کبھی کہیں ٹوٹتے ہیں۔ چار دن عیش کر لیں۔ مگر بڑھاپے میں تو میرا پتی میرا ہی ہوگا۔" چاچی نے بڑے غرور سے کہا۔

مگر جوانی میں کیوں نہیں ——— ؟ میں یہ بات پوچھنے پھڑکی اور جلدی سے اپنے احمق پن پر شرما کے بیٹھ گئی۔ چاچی بچاری کتنی سیدھی ہیں۔ جانے کس نے ان کے دل میں یہ باتیں بٹھا دی ہیں۔ بس انھیں لکیروں پہ دوڑے جائے گی۔ سنا ہے بھیشم چاچا کبھی لائے تو چاچی نے کسی سے اس کی شکایت نہیں کی۔ چاچا سے بھی نہیں، جنھوں نے ان کی شادی کی ساریاں اور زیور تک راجا کو پہنا دیے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کسی مرد نے ایسی جرأت پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ لڑکوں کا پورا مول لڑکی والے دیتے ہیں۔ مگر چاچا کو یہ بات کون یاد دلاتا؟

آج پچاس برس بعد بھی وہ دن میری آنکھوں میں گھوم رہے ہیں۔ کہتے ہیں مرتے سمے من کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ شاید موت میرے پاس آ رہی ہے۔ آج راجا نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ میں اب بوڑھی ہو گئی ہوں۔ یہ بات کہتے وقت وہ کیسی حقارت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی جوانی کو جانے کیسی رسیوں سے باندھ رکھا ہے!

اونہہ ——— میں ان گندے خیالوں کو دل سے نکال کر کروٹ بدل لیتی ہوں۔ اب مجھے اپنے پاس اپنے تینوں جوان بیٹوں کو بلانا چاہیے۔ جو میری ارتھی اٹھائیں گے۔ مگر وہ سب تو مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں۔ انھیں میرے مرنے کی خبر بھی نہ ہوگی۔ میرا دماغ بھی تو بیٹی کی صورت نہیں دیکھنے دیتا۔ اسے یہ شکایت ہے کہ میں نے اپنی سب دولت بیٹوں میں بانٹ دی۔ بیٹی کو کچھ نہ دیا۔ یہ کیسی حماقت ہوئی

مجھ سے! میں نے اپنی دولت کیوں لٹا دی۔ ان لوگوں کو کیوں دے دی جو اس کے حق دار نہ تھے۔ مجھ سے تو کوئی بھی خوش نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میری بوڑھی ماں کے غصّہ اور بڑھاپے سے ہم سب بیزار تھے۔ ماں کی ضد دیکھ کر ناٹینا بچوں سے کہا کرتے تھے کہ جانے کیسے میں نے اس ضدی بڑھیا کے ساتھ عمر بتائی اور اب یہی بات میرا پتا اپنے بچوں سے کہتا ہے۔ بیٹوں کو بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایسی احمق ماں کے پیٹ سے ان جیسے ہوش مند انسان کیسے پیدا ہوئے!

مجھے اپنے احمق بننے کا وہ پہلا دن یاد آرہا ہے جب پہلی بار میں نے اپنے پتی کی دہلیز پہ قدم رکھا تھا تب میں نے جانا کہ ماں اور چاچی اپنے آپ کو اتنا حقیر کیوں سمجھتی تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو میں بھی اپنے پتی کے اوپر سے اپنی دس زندگیاں نچھاور کر کے پھینک دیتی۔ وہ تو سچ مچ مجھے اپنے ہاتھ سے نوالے کھلا سکتا تھا۔ مجھے زندگی بھر مسند پہ بٹھائے رکھتا۔ لیکن میری سسرال تو بھٹیار خانہ تھی۔ تین کمروں کے چھوٹے سے گھر میں پندرہ بیس آدمی رہتے تھے۔ دن رات چیخ و پکار مچی رہتی۔ رات میں ایک دو بجے سے پہلے اتنا سکون بھی نہ ملتا کہ وہ میری طرف دیکھنے کی جرأت کر سکیں۔ پھر میری بیمار ساس جانے کب سے یہ ارمان لئے بیٹھی تھی کہ بہو آئے تو وہ صرف اپنی خدمت کے لئے وقف ہو جائے۔ وہ میری فرمائش پہ رنگین ساریاں بھی لائے اور پھولوں کی بینی بھی۔ مگر گھر میں کوئی ایسا کونا نہ تھا جہاں سب سے چھپا کر وہ میرے بالوں میں پھول سجا سکتے۔ بڑے بھائیوں، بھاوجوں اور کنواری بہنوں کے سامنے ایسی بے شرمی کون کر سکتا ہے۔ اتنے بڑے گھر کے کام دھندے میں لگ کر مجھے اتنی فرصت بھی نہ ملتی کہ اپنے بالوں میں کنگھی کر لوں۔ کسی وقت سندور کا ٹھونٹو لگانے میں آئینے کے سامنے جاتی تو میری ساس چلانے لگتی تھی ——— "کسبیوں کی طرح ہر وقت آئینے میں اپنی صورت کیوں تکے جاتی ہے۔ چل میرے سر میں تیل ڈال دے!"

لیکن میرے دل کے ارماں پھر بھی نہ دبتے۔ جب سب سو جاتے تھے تو میں راجا کی طرح سنگار کرتی۔ ویسی ہی ساڑھی پہنتی۔ وہ دن میری زندگی میں پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔

پھر رما میری گود میں آگئی ——— اس نے تو جیسے قسم کھائی تھی کہ اپنی دادی کی طرح ایک منٹ مجھے چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔ کسی وقت میں سوچتی تھی کہ رنڈیوں کے بچے نہیں ہوتے

اسی لئے تو وہ عیش کرتی ہیں۔ نہ ساس سسرے کی شرم نہ گھر کا کام کاج۔ مگر بڑھاپے میں معلوم ہوتا ہے اس عیش کا مزہ۔ یہ سوچ کر میں ربا اور اس کے بھائی رتنم کو کلیجے سے لگا لیتی تھی۔ میں کتنی نصیب والی ہوں۔ بھگوان نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔

پانچ برس بعد تین بچوں کو لے کر میکے گئی تو کوئی مجھے پہچان ہی نہ سکا۔ میری ساس اور تینوں بچوں نے مل کر میری رگ رگ سے خون نچوڑ لیا تھا۔ میرا رنگ روپ سب ختم ہو چکا تھا۔ ماں نے بستی کی ہر عورت کو وہ دکھ سنائے جو میں نے سسرال میں اٹھائے تھے اور جو ہر ماں بڑھا چڑھا کر پڑوسیوں کو ضرور سنایا کرتی ہے۔ ماں کی شکایتیں سن کر سندرما چاچی نے کہا تھا ——— "ارے بیٹی تو جس چھری سے گلا کاٹے اس چھری کا بھلا۔ ہماری بیٹی کوئی کسبی تھوڑی تھی کہ صرف عیش کرنے سسرال گئی تھی۔ سسرال کو اپنا بنانے اور بچے پیدا کرنے میں تو دکھ اٹھانا ہی پڑتا ہے"

میکے آکر مجھے معلوم ہوا کہ ملیشم چاچا کا کاروبار بیٹھ گیا ہے۔ اس لئے راجا انھیں چھوڑ کر ایک شہر والے سیٹھ کے پاس چلی گئی ہے جس نے اسے کار بھی لے دی ہے۔ چاچا پھر اپنے گھر آ گئے تھے۔ مگر اس شان کے ساتھ جیسے کوئی ملک فتح کر کے آئے ہوں۔ دن رات چاچی پر برستے، بچوں پر گرجتے۔ لات مار کے کھانے کے برتن پھینک دیتے۔ چاچی دم سادھے، سر ڈھانپے، سارے گھر میں دوڑتی پھرتی تھیں۔ لیکن من ہی من میں بہت خوش تھیں کہ آخر بھولا بھٹکا آدمی ان کی پناہ میں آ گیا۔

مجھے ملیشم چاچا کو گھر میں دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ وہ اب زندگی بھر چاچی کو صورت نہ دکھائیں گے۔ اپنے کئے پر ہمیشہ پچھتائیں گے۔

چاچی اپنے پتی کے لوٹ آنے کی خوشی میں دیول گئیں تو میں بھی ان کے ساتھ گئی۔ پوجا کے بعد جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو میرے سامنے ایک دیوی کھڑی تھی۔ اتنی سندر جیسے بھگوان نے ہی یہ روپ بدلا ہو۔ اس نے مسکرا کر میری اور دیکھا تو میں پیچھے ہٹ گئی ——— وہ راجا تھی۔ ستی ساوتریوں کی طرح سر پہ پلو ڈالے۔ نگاہیں جھکائے۔ جانے وہ بھگوان سے کیا مانگنے آئی تھی! شاید اب اسے اپنے بڑھاپے کی فکر ہو۔ مگر اس نے اپنی جوانی جانے کیسے سنبھال کر رکھی تھی کہ وہ اب اور بھی چمک رہی تھی۔ کھلے پھول کی طرح۔ ویسا ہی کسا کسا بدن۔ وہی جادو بھری مسکان کہ دیواستا

بھی اپنا فرض بھول کر اس کی خواہش پوری کر بیٹھیں۔ اسے دیکھ کر میرے من میں آگ سلگ اٹھی۔ بھگوان اسے اپنے کئے کی سزا کب دیں گے! یہ کب تک یوں ہی مسکراتی رہے گی!

پوجا ختم کر کے وہ میرے پاس سے گزری تو میرا بدن پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اور ایکبار پھر بھگوان کے سامنے بیٹھ کر میرے پاپی من میں یہ گندہ سا خیال آیا کہ راجا کتنی خوش قسمت ہے! اور پھر سہم کر میں نے اس بات کو بھگوان کے دھیان میں ڈھکیل دیا۔

اب کی بار میں سسرال گئی تو بھگوان نے سچ مچ میرے دن پھیر دیئے۔ انھیں مدراس کے ایک فلم اسٹوڈیو میں نوکری مل گئی تھی۔ اب میں اپنی ساس نندوں سے دور، ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ بچپن سے سینت کر رکھے ہوئے ارمان پورے ہونے لگے۔ میرے بچّے بھی اب سیانے ہو رہے تھے۔ رما ہائی اسکول کا امتحان دینے والی تھی اس لئے اب میں اسے بار بار کوٹھے پر بھیجنے لگی تاکہ وہ وہاں چین سے پڑھے۔ اب میں اچھی اچھی ساریاں پہن کر، بالوں میں پھول سجا کر ان کا انتظار کرتی تھی۔ مگر انھیں کام سے فرصت ہی نہ ملتی۔ رما سولہ برس کی ہو رہی تھی۔ اس کے بیاہ کی فکر ہمیں کھائے جاتی۔ وہ شام کو بھی آفس میں رک کر اور کام کرتے کہ زیادہ پیسے ملیں۔ رما نے ہائی اسکول پاس کر لیا تو میں نے اپنے اچھے کپڑے اور زیور اس کے لئے رکھ لئے۔ اب تو میں بھی اس عمر سے نکل چکی تھی جب ہر چیز پر من مچل اٹھتا ہے۔ اس وقت چار بچوں کو پالنا پڑھانا بڑا کٹھن کام تھا۔ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے وہ بھی بد مزاج ہو گئے تھے اور اپنی ہر پریشانی کا ذمہ دار مجھ ہی کو سمجھتے تھے۔ ان فکروں نے مجھے بھی نڈھال کر دیا تھا۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ میرا دل کمزور ہے۔ مجھے اچھا کھانا چاہئے۔ آرام کرنا ضروری ہے۔ مگر چار بچوں کی ماں کیسے اچھی چیز کھا سکتی ہے کب آرام کر سکتی ہے۔

ان ہی دنوں مجھ سے جانے کسی نے کہا تھا کہ راجا اب یہیں مدراس میں رہتی ہے اور اس نے کسی کی ایک بچی لے کر پال لی ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اب چڑیل کو معلوم ہوگا کہ عیش کرنے کی سزا کیا ہوتی ہے۔ اولاد اور پتی کے بغیر زندگی کیسے گزرتی ہے۔ مگر سنسار کی فکریں جتنی جان لیوا ہیں اتنی ہی پیاری بھی ہوتی ہیں۔ جس دن رستم اسکول سے دیر کر کے آتا تھا تو میری آدھی جان نکل جاتی۔ جس دن وہ غصہ میں کھانا اٹھا کر پھینک دیتے تھے، ان کے بھوکے رہنے پر میں ساری رات

روئے جاتی تھی۔ پھر میں ان کے پاؤں چھوتی۔ اپنی ہونی اور ان ہونی، سب خطاؤں کی معافی مانگتی، تب وہ ہنس پڑتے۔ ہمارے من تو بھگوان نے ہی ایسے بنائے ہیں کہ پتی کو سدا اونچا بٹھانے پر ہی شانتی ملتی ہے۔ چاہے وہ مجھ سے کتنا ہی لڑے ہوں۔ لیکن میرا دل کبھی نہ چاہا کہ میں ان سے دور میکے میں جا کر راج کروں۔

کمر تک قرض میں ڈوب کر جب ہم نے رما کا بیاہ کیا تو وہ اپنی ہمت کھو بیٹھے لیکن میں نے انکی ہمت بندھائی کہ اب ہم رتنم کا بیاہ کر کے دھن دولت سے اپنا گھر بھر لیں گے۔ لڑکی پرائی ہوتی ہے مگر بیٹا تو اپنا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بات اتنی غلط ہو گی۔ کیونکہ ابھی رتنم انجینئر بنا بھی نہ تھا کہ اس نے اپنی ہی کلاس کی ایک لڑکی سے بیاہ کر لیا۔ وہ نہ تو ہماری دعائیں لینے آیا نہ اس کی بہو نے ہمارے گھر میں قدم رکھا۔

اب تو بیس برس گزر گئے ——— جانے رتنم اس گھر کا بیٹا تھا بھی یا نہیں۔ میں دیوار پر لگی اس کی تصویر دیکھتی ہوں تو اس کے پیدا ہونے سے لے کر انجینئر بنانے تک کے سارے دکھ ایک دم جاگ پڑتے ہیں۔ رتنم چلا گیا تو ہمیں اس کے بھائیوں سے بھی کوئی امید نہ رہی۔ اسی ڈر سے میں نے دونوں بیٹوں کے بیاہ جلدی جلدی کر دیئے۔ ان کے جہیز رکھنے کو میرے گھر میں جگہ نہ رہی۔ انکے بچوں سے میرا گھر بھر گیا۔ میں سوچتی کہ اب بھگوان سے اور کیا مانگوں! میں نے اپنی بہوؤں کو اٹھ کر پانی بھی نہ پینے دیا۔ ان کے لئے الگ الگ کمرے بنائے تاکہ بیٹا بہو کے بالوں میں پھول سجا سکے۔ مگر بڑھاپے میں انسان کا دماغ ٹھکانے پر نہیں رہتا۔ میں بھی جانے پاگل پن میں کیا کر دیتی ہوں کہ بہوؤں اور بیٹوں کو میری ہر بات سے تکلیف پہنچتی ہے۔ میرے کام کرنے پر وہ چپکے چپکے کہتی ہیں ———

"اس بڑھیا کو کتنی ہوس ہے۔ خود مرتی ہے مگر ہمیں گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔"

مجھے اپنے گھر سے اتنی محبت جانے کیوں ہے! کوئی بچہ گلاس توڑ دیتا ہے تو اس کے ٹکڑے میرے دل میں چبھتے ہیں۔ بہو ہنڈیا جلا دے تو چرکے میرے بدن کو لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنا دل کیوں جلاتی ہو۔! وہ کیا جانیں کہ یہ گھر مجھے کتنا پیارا ہے۔ یہاں کے ذرّے ذرّے کو میں نے کتنی محنت سے جمع کیا۔ اس سے بڑا بھی کوئی دکھ ہوتا ہوگا کہ کوئی ہمارے سپنے

ہم سے چھین لے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ساسیں بہوؤں کے آنے سے جلتی ہیں، وہ کیا جانیں کہ بہوئیں ہمارا گھر چھین کر کتنی بڑی سزا دیتی ہیں۔!

اب میں اکیلی اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔ سب اس بات کے منتظر ہیں کہ مرتے وقت میں اپنا خزانہ کس کے حوالے کروں گی۔ میرا سجا بنا گھر اب بہوؤں نے اصطبل بنا دیا ہے۔ مجھے جلانے کے لئے وہ دونوں مل کر خوب گندگی پھیلاتی ہیں۔ میں غصہ میں آجاؤں تو بیٹے شکایت کرتے ہیں۔ "آپ ہر وقت سدھا کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ آپ کہیں تو ہم آج ہی گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔؟"

یہ سن کر میں ڈر جاتی ہوں کہ یہ بات کہیں ان کے باپ تک نہ پہنچ جائے۔ وہ تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں مجھ پر غصہ اتارنے کا۔ وہ بھی کیا کریں۔! ایک نکمٹو بوڑھے کو غصہ آئے تو کیا وہ کماؤ بیٹے اور نک چڑھی بہو سے کچھ کہہ سکتا ہے! بھگوان زندگی اتنی لمبی کیوں کر دیتے ہیں کہ اپنے پرائے، سب بیزار ہو جائیں۔!

جب کوئی کام نہ ہو تو میرا دل بڑی اوندھی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہے —— مگر اسی وقت میرا بڑا پوتا مجھ سے ہنس کر پوچھتا ہے۔" یہ بتاؤ بڑی اماں کہ تمھارے پاس کتنی دولت ہے — ہمیں کب دوگی ——؟" اور میں آنسو پونچھ کر سوچتی ہوں کہ میں کتنی مفلس ہوں۔ میں نے اپنی ہر چیز کتنی لاپروائی سے لٹا دی۔ کچھ بھی تو بچا کر نہ رکھا۔

ساری باتیں کیوں یاد آئے چلی جا رہی ہیں ——! اگر آج میں بہو کے ساتھ ایک فلم کی شوٹنگ دیکھنے نہ جاتی تو اب تک مزے میں سو سکتی تھی۔ مگر بہو کی چھوٹی بچی کو سنبھالنے کے لئے مجھے اس کے ساتھ ایک فلم اسٹوڈیو جانا پڑا تھا۔ وہاں بڑی خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ لیکن ایک لڑکی کے پیچھے ساری خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ بہو نے بتایا کہ یہی وہ ایکٹریس ہیں جو دس بارہ لاکھ پر بمبئی سے یہاں کام کرنے آئی ہیں۔

"مگر اس کی صورت میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے جو اتنا کما لیتی ہے۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"کسبی کی ذات ہے ——" میری بہو نے چپکے سے کہا —— "ارے ماں یہ بے چاریاں کیا جانیں کمانا —— ان کی پالنے والیاں ہوتی ہیں چالاک۔ انھیں ادائیں اور داؤ پیچ سکھا کر خود عیش

کرتی ہیں۔"

پھر وہ عیش کی ٹھیکیدار، ایک خوبصورت سی کار میں بیٹھ کر آگئیں —— سب کھڑے ہوگئے۔ فلم کے ڈائرکٹر نے بڑھ کر خود دروازہ کھولا تو وہ اتریں —— ہزار سلاموں کا نگاہوں سے جواب دیتی —— یوں جیسے کوئی مہارانی چلی آرہی ہو۔ بہت قیمتی ساری پہنے —— گھرا گھرا میک اپ کئے —— لوگ ہٹو بچو کرتے ان کے لئے رستہ بنارہے تھے کہ بے بی کی ممی آرہی ہیں۔ جب وہ میرے قریب سے گزریں تو میں چلا پڑی —— راجا —— راجا —— راجا نے گوگلز اتار کر مجھے بڑے غور سے دیکھا —— پھر اپنے کسے کسے بدن پر ساری پھیلاتی ہسکراتی، لجاتی وہ میری طرف بڑھی۔

"تم —— تم تو نیکاً ہو —— ! اتنی جلدی اتنی بوڑھی کیسے ہوگئیں —— ؟"

اندھیرے کمرے میں اکیلی پڑی اب میں سوچ رہی ہوں کہ اتنی جلدی میں اتنی بوڑھی کیسے ہوگئی —— ؟

جمیلہ ہاشمی

آپ بیتی، جگ بیتی

"نرائن چاچا نے تو دنیا تیاگ رکھی ہے۔ نہ کبھی بیاہ شادی میں جاتا ہے اور نہ ہی کسی کے مرنے پر افسوس کے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے بے سدھ سی۔ انسان جیتا تو اس لئے ہے کہ بڑھاپے میں اس کے چار دوست ہوں، چار پاس بیٹھنے والے ہوں، لوگ اس کا نام لیں تو عزت سے اس کی طرف دیکھیں اس کے تجربے اور عقل سے کام لیں اس کے صلاح مشورے کو اہمیت دیں اور یہ نرائن چاچا ہے کہ بس حویلی میں گھومتا رہتا ہے۔ گھر بار کا جھنجھٹ بھی نہیں کسی سے کوئی رشتہ داری نہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی اور جینا ہے جیتن ؟"

اور جیتن نے مجھے گھوم کر یوں دیکھا گویا یہ باتیں میں نے نرائن چاچا کے لئے نہیں کہیں اسکے لئے کہی ہوں۔ حویلی سے باہر بڑ کے گھنے اور بوڑھے پیڑ پر پرندے بسیرا کرنے کے لئے آرہے تھے شاخیں بار بار ہل رہی تھیں شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شام کی سرخیاں درخت کے پرے سے غائب ہو رہی تھیں اور گہرے اندھیرے میں لمبی لمبی لٹکتی داڑھیوں سے خوف آتا تھا۔

"تم کیا جانو کئی دکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی اتھاہ خاموشی، ساگر کی طرح زندگی کی حدوں سے پرے موت کی حدوں سے دور بھگوان کے گھر کو چھونے لگتی ہے۔ ہر تام۔ ہو سکتا ہے نرائن چاچا کو بھی کسی ایسے دکھ سے پالا پڑا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے ماضی میں بھی ایسی یاد ہو جو پھیل کر اندھیرے کی طرح ساری زندگی پر چھا جاتی ہے"!

پر یادوں کا دکھ بھی دھیرے دھیرے کم ہو جاتا ہے اور اندھیرے سے مانوس آنکھیں اسی تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ کلونت کی موت کا غم ایسا نہ تھا جس نے کسی کو چھوا نہ ہو۔ سوائے نرائن چاچا کے۔ وہ اس گرتی ہوئی دیواروں والی پرانی حویلی میں زخمی جانور کی طرح گھوم رہا ہے جیسے یہ دنیا کلونت کے مرنے پر ذرا سی بھی تبدیل نہ ہوئی ہو جیسے کلونت کا مرنا کوئی بات ہی نہ ہو۔

"ہرنام، کلونت تمھاری بہن تھی نا میری بیوی تھی نا. ہم دونوں کا غم دوسری دنیا کے غم سے کس طرح ایک سار ہو سکتا ہے تم نے اس کے ساتھ بچپن گزارا تھا۔ تم اور وہ دونوں ایک ہی آنگن میں ایک ہی تھالی سے کھا کر بڑے ہوئے تھے۔ ایک ہی ماں کا خون تمھاری رگوں میں تھا۔ پر نرائن چاچا سے اس بات کا گلہ کرنا فضول ہے۔"

"جیتن تم نے غلط سمجھا ہے میں نرائن چاچا سے کسی بات کا گلہ نہیں کر رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں ایسی بے حسی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ اس سے پہلے لوگ کہا کرتے تھے نرائن چاچا ایسے ہیں ویسے ہیں میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ پر چار دن پہلے جب کلونت کی ارتھی اٹھی ہے تو دیواریں بھی رو رہی تھیں یہ درخت بھی ماتم کرتے دکھائی دیتے تھے۔ بادلوں کی گھپ تاریکی سے جی ڈر رہا تھا مندر کے بوڑھے پجاری جو کسی کے مرنے پر صرف ٹھنڈا سانس لے کر سمرن کرنا شروع کر دیتے ہیں اسے دیکھنے آئے تھے۔ گاؤں میں کون تھا جو رو نہ رہا ہو مگر نرائن چاچا جیسے پتھر ہے اس کے پاؤں میں حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے حویلی کے کواڑ کھول کر باہر نہیں جھانکا۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کوئی زندگی اور جینا ہے نہ کسی کے دکھ سے دکھی اور نہ کسی کے سکھ میں شریک۔"

پھر ہم دونوں چپ ہو گئے جیسے کہنے کے لئے یہ بات نہ رہی ہو۔ دنیا کے اور لاکھوں دھندے ہیں۔ کلونت کے دس دن بعد اس کی چھوٹی سی بچی بھی مر گئی۔ پے در پے اس مصیبت نے تو ہم سے حواس بھی چھین لئے۔ گھر میں نئے سرے سے رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔ خزاں کے لمبے بے ہنگم اداس دن آ گئے۔ آندھیاں چلتی رہتیں۔ بڑی شاخیں تقریباً ننگی ہو گئیں اور دور چوٹی کے قریب بنے ہوئے چیلوں اور کوؤں کے گھونسلے بڑے بے آسرا سے نظر آنے لگے۔ آسمان پر سارا وقت ایک زرد رنگ کا غبار گھومتا رہتا اور آٹے کی چکی کی مسلسل کوک سے میرا دل گھبرا اٹھتا۔ خشک پتے گاؤں کی گلیوں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہتے اور فضا میں گوبر، موت، اپلوں اور سڑے پانی کی بو ملی رہتی۔ ایک سال پہلے کلونت جب زندہ تھی گھر میں خوشیاں تھیں۔ اس کے چرخے کی گھوں گھوں سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک سال بعد خزاں ایسی ویران اداس اور دل کو گھبرانے والی ہو گی۔

باہر بارش ابھی شروع ہوئی تھی، ہوا بہت زوروں سے چل رہی تھی اور چوپال کے ساتھ والے بڑ کی داڑھیوں میں سائیں سائیں کے شور سے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مٹی کی سوندھی خوشبو پھوس کے دروازے میں سے اندر آ رہی تھی اور گوبر کی بو کے ساتھ مل کر عجیب غمناک تاریکی پیدا کر رہی تھی۔ دیئے میں تیل کم ہوتا جا رہا تھا۔ ہم سب رام دلارے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ گاؤں کا نمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی باتوں کا رس اس کی

آواز کا رعب اور اس کی شخصیت کی کشش ہمیں روز اس کا انتظار کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ بہت لمبے چوڑے کنبے والا بڑا مصروف آدمی تھا مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ چوپال میں نہ آئے محفلیں اس کے بغیر سونی رہتی تھیں۔ چودھری کریم بخش بھی یوں تو بڑا زوردار باتونی تھا مگر رام دلارے میں جو بات تھی وہ اس میں کہاں۔ اور اس لیے حقہ پیتے آگ تاپتے، باتیں کرتے ہم جم کر نہیں بیٹھتے تھے۔ ہر گھڑی کپڑوں کے بھڑے ہوئے دروازے کی طرف نظر اٹھ جاتی تھی۔ نہ جانے رام دلارے کیوں نہیں آیا؟ اور پھر باہر بارش شروع ہو گئی تھی اور ہوا سائیں سائیں کرتی، بین کرکے گزرتی ہوا تو میرا دل دہلا رہی تھی۔ سنتوک سنگھ نے الاؤ پر اور اپلے رکھ دیے آگ کو چمٹے سے ایک دو بار ادھر ادھر کیا اور پھر کہنے لگا، "چپ بیٹھے کب تک راہ دیکھیں گے شمشیر سنگھ یار تم ہی کوئی بات کہو۔"

شمشیر سنگھ کہنے لگا "فصلوں کے گاہنے بونے کے دن دور ہیں خالی دنوں میں میں کیا بات کروں۔ سمجھ نہیں آتی آج رام دُلارے کیوں نہیں آیا۔ وہ تو کبھی اتنی دیر سے نہیں آتا۔ اس نے کبھی چوپال سے ناغہ نہیں کیا۔" سنتوک سنگھ بولا "چودھری یار آج کچھ دل اتر رہا ہے میرا تو۔ واہ گرو اچھی ہی کرے۔ باہر بارش ہو رہی ہے۔ یہ یار نمبردار آخر کہنے والا ہے پھر آج ایک سنگھوڑی کا سودا کرنے دوسرے گاؤں گیا تھا بات نہ بنی ہو گی کل کے لیے ٹھہر گیا۔

کریم بخش نے کہا۔ یہی بات ہو سکتی ہے اور اگر تم ایسے ہی فکرمند ہو تو دو قدم پر گھر ہے جا کر نمبردار کا پتہ کیوں نہیں کرتے۔ بارش سے ڈر گئے ہو جوان؟

"ڈر کون گیا ہے!" سنتوک سنگھ نے کھڑے ہو کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا "اگر یہ بات ہے چودھری تو لو میں چلا۔ کیا تم سمجھتے ہو سنتوک سنگھ بارش سے ڈر گیا؟ ارے خون کی ہولی کھیلنی پڑے تو کبھی ڈروں نہیں۔ واہ گرو کا خالصہ ہوں سمجھتے کیا ہو۔ لو میں تو چلا۔"

چودھری کریم بخش اور شمشیر سنگھ نے اس کے کھیس کا پلو پیچھے سے پکڑ کر کھینچ لیا اور بولے "بس بس دیکھ لی تیری دلیری یار آگے ہی کون سی رونق ہے جو تو بھی جا رہا ہے۔ کیا یہ بات کوئی کہنے کی ہے کہ تو بہادر ہے یا نہیں۔ بس اب بیٹھ جا۔"

اور پھر بڑے زور سے دروازہ کھلا رام دُلارے کی بجائے نرائن چاچا اندر آ گیا۔ اس کی سفید داڑھی سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ اس کی پگڑی پانی سے بھیگی ہوئی تھی۔ کھیس نہ ہونے کی وجہ سے قمیص بھی جسم سے چپک گئی تھی۔ پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔

"نرائن چاچا تم آج ایسے میں چوپال کیسے آگئے"۔ شمشیر سنگھ، سنتوک سنگھ اور چودھری نے ایک ساتھ کہا۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گیلے پاؤں سے گلی کی کیچڑ کو صاف کیا۔ جھٹکے سے پگڑی اتار کر دونوں ہاتھوں سے اسے نچوڑنے لگا پھر اس نے پاس کھڑے شمشیر سنگھ کو نچڑی ہوئی پگڑی دے دی اور کرتا اتار کر اسے نچوڑا۔ اتنی سخت سردی کے باوجود نرائن چاچا کانپ نہیں رہا تھا۔ اس کی چھاتی لوہے کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ اس کا آج یوں اچانک چوپال میں آجانا ایک زلزلے سے کم نہ تھا۔ ہم سب چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نرائن چاچا لگ رہا تھا جیسے ایسی اندھی اندھیری رات میں کسی شمشان سے نکل کر ہمیں ڈرانے کے لئے آیا ہو۔
پھر اس نے چوپال کے ایک کونے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا "کیوں شمشیر سنگھ کچھ کھانے کے لئے مل سکے گا؟" اور شمشیر سنگھ کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ برسوں سے ہم لوگ نرائن چاچا کو حویلی میں چپ چاپ گھومتے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اس نے کبھی کسی کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ کھانا وقت پہ کسی نے بھجوا دیا تو کھا لیا۔ نہیں ملا تو خاموش ہو رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے کبھی اسے بولتے ہی نہیں سنا تھا اور آج یہ آواز جیسے کہیں دور کسی غار میں تازہ پانی کے چشمے کے چلنے کی آواز ہو وہاں اس کونے سے آئی تھی۔
"شمشیر سنگھ!" نرائن چاچا نے پھر کہا۔ "گھر جا کر روٹی ساگ جو کچھ بھی ہو لے آ۔ بھوک سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔"
اور اٹھتے ہوئے شمشیر سنگھ کا کھیس اس کی بے دھیانی میں پاؤں میں اٹک گیا۔ بارش اور کیچڑ اندھیرے کی پرواہ کئے بغیر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
کھلے دروازے میں سے بارش اندر آ رہی تھی۔ چیتن نے ہڑبڑا کر پہلو بدلا اور نرائن چاچا کو وہاں دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔
پانی میں بھیگا تہبند کو گھٹنوں سے اوپر اٹھائے شمشیر سنگھ گیا اور اس نے روٹی نکال کر چاچا کے سامنے رکھ دی۔
چاچا نے نہ جانے کتنی دیر میں روٹی ختم کی ہوگی۔ پانی پی کر زور کا ڈکار لیا۔ ہاتھ اپنی سفید داڑھی پر پھیرے اور آگ کے قریب ہو کر کہنے لگا۔ "جوانو تم چپ کیوں ہو۔ چوپال آج سے تیس سال پہلے تو اتنی سونی نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہاں قہقہے گونجا کرتے تھے۔ جوان اونچی آوازسے 'ماہیا' اور 'ہیر' گایا کرتے تھے۔ بولیاں کہاوتیں آپ بیتیاں جگ بیتیاں کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ اور آج تیس سال بعد اس چوپال میں آکر تو میرا دل سرد ہو گیا۔ تم چپ کیوں ہو، باتیں کرو۔ میں باتیں سننے ہی تو آج یہاں آیا ہوں۔"

چیتن بولا۔" نرائن چاچا موت بڑی ظالم ہے سارے چین چھین لیتی ہے تب جگ بیتیاں آپ بیتیاں لگنے لگتی ہیں اور سرد راتوں میں جی چاہنے کے باوجود بات نہیں ہو سکتی۔ ہم کہانیاں کیا کہیں گے۔"

کرم بخش چودھری ہمیشہ کا باتونی آج خاموش بیٹھا اپنے حقے کی نے منہ میں رکھے کچھ سوچ رہا تھا اور شمشیر سنگھ نے کھیس کو جھٹک کر آگ کے قریب پھیلا دیا تھا۔ چھت پر بارش بڑے زور سے شور مچا رہی تھی اور سوندھی خوشبو میں پانی کی نمی کی باس مل کر اندر پھیل گئی تھی۔

نرائن چاچا بولا۔" چیتن سنگھ جب بات کرنے کو جی نہ چاہے تو چوپال میں موت کا سناٹا کیوں پھیلاتے ہو تمھارا خیال ہے مکلونت اپنے ساتھ زندگی کی ساری ادھوری ان کہی کہانیاں اور دکھ سکھ سمیٹ کر لے گئی ہے۔ تمھاری زندگی اتنی خالی تو نہیں ہو گئی کہ گا بھی نہ سکو۔"

چیتن تو جیسے چاچا کی ہر بات کا جواب دینے پر تیار ہی تھا بولا۔" جو گیت دوسروں کے دلوں کو شانتی اور سکھ نہ دے سکیں ان کے سنانے سے فائدہ اور چاچا میں کہتا ہوں ہیر کی باتیں پرانے قصے ہیں ان کو بھول ہی جاؤ تو بہتر ہے۔"

نرائن چاچا نے کہا۔" ہیریں روز پیدا ہوتی ہیں اور روز مرتی ہیں چیتن دکھ کی دوڑ میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا۔"

سنتوک سنگھ نے آگ پر اپلے پھینکے تو راکھ اڑ کر سب پر گری۔ آگ کے ننھے شعلے زبانیں نکالے لپک کر اپلوں کے ساتھ لگ گئے۔ بالکل یوں جیسے نرائن چاچا کے کہنے کے مطابق دکھ کی دوڑ میں کوئی اکیلا نہیں ہوتا یہ آگ سب کو چاٹ جاتی ہے۔ ہر ایک دامن تک اس کی گرمی جلدی یا دیر سے ضرور پہنچ ہی جاتی ہے۔

چیتن جیسے کوئی بات بعد میں یاد آئے کہنے لگا۔" کیوں چاچا آج تم کیوں قصہ نہ کہو۔ آج تم کوئی آپ بیتی جگ بیتی سناؤ۔ چوپال کے سونے پن میں ویرانوں کی کہانیاں گم کر دیں۔ گیتوں میں کیا رکھا ہے کیوں شمشیر؟" اور شمشیر سنگھ نے جیسے کسی خواب سے چونک کر کہا ہو۔" ہاں ہاں گیتوں میں کیا رکھا ہے۔" وہ نہ جانے کتنا اداس تھا اور اسے کیا یاد آ رہا تھا۔" چاچا تم ہی کوئی بات کرو۔ باہر کیسا اندھیرا ہے اور بارش نے تو دل اداس کر دیا ہے۔"

نرائن چاچا نے ہولے ہولے جھکا ہوا سر اٹھا کر ان پرانی بوڑھی آنکھوں سے شمشیر سنگھ کو دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔" تیس سال سے اس راز کو سینے میں دبائے دبائے اب تو میرا سانس بھی رکنے لگا ہے۔ مجھ میں اور سہنے کی ہمت نہیں رہی کیوں جوانو تم میں سننے کی ہمت ہو گی؟"

چیتن اٹھ کر الاؤ کے قریب آ گیا۔ میں نے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ شمشیر نے زور سے کہا۔" واہ گرو کا خالصہ واہ

گرو کی جے!" سنتوک سنگھ نے چمٹے سے آگ کو کریدا اور چودھری کریم بخش نے حقے کی نے منہ سے نکال کر اسے دیوار سے ٹکا دیا۔

"تم میں سے کسی نے گوبندی کو نہیں دیکھا ہوگا۔ گوبندی میری چھوٹی بہن تھی۔ اسی حویلی کے دالانوں اور نیچی چھتوں والے بڑے بڑے کمروں میں کھیلتی کھیلتی وہ اچانک بڑی ہو گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ کسی جادو کے زور سے بڑی ہو گئی تھی۔ نہیں یہ بات نہیں، میں اس سے دس سال بڑا تھا نا۔ گھوڑ دوڑ، کھلیانوں کی حفاظت اور گھومنے پھرنے میں بچپن کے دن گزار کر جب میں نے ہوش سنبھالا تو گوبندی میری انگلی پکڑ کر دور تک پھیلے کھیتوں کے کنارے ایک چھوٹی سی گڑیا کی طرح پھیرا کرتی تھی۔ میں تین چار سال میں نہ جانے کتنی حدیں پار کر گیا تھا کہ جب اس نے گوٹے لگی چنریاں اوڑھنی شروع کی ہیں اور گڑیوں سے کھیلنے لگی ہے تو میں سنتو کے عشق میں مبتلا تھا۔ سنتو آج نہیں ہے۔ بچپن کی محبتوں کی طرح وہ بھی دور پیچھے چھوٹ گئی ہے۔ جنگل کی آگ کی طرح اس کی محبت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سنتو مجھ سے پانچ سال بڑی تھی اس کا باپ ہمارے کھیتوں میں کام کیا کرتا تھا۔ اس کا گونا کرکے باپ نے ابھی سسرال نہیں بھیجا تھا۔ میں نے بھی ان دنوں گاؤں کی لڑکیوں کو آنکھیں کھول کر ذرا بس میٹھی نظروں سے دیکھنا شروع ہی کیا تھا۔ میرے جیسے اور کم عمر دوست بیٹھ کر کسی باغ میں تاڑی پیتے اور نشے میں بہک کر لڑکیوں کی باتیں کرتے۔ انھی مجلسوں میں میں نے سنتو کا نام بھی سنا۔ سنتو کے بعد میں نے ویسی طرحدار عورت پھر کبھی نہیں دیکھی۔ اس کے رنگ میں گندم کا سنہرا گھلا ہوا تھا اور چہرے پر چمک دبی دبی تھی۔ جیسے کوئی ہیرا کسی پردے کے پیچھے سے دمک رہا ہو۔ آنکھوں میں کسی نے ستارے کوٹ کر بھر دیے تھے۔ اس کے لمبے بال کتنے کالے تھے چوٹی چلتے میں یوں چلتی گویا کوئی ناگن مستی میں جھول رہی ہو۔ سنتو سے زیادہ پرکشش چال میں نے کسی عورت کی نہیں دیکھی۔ اور پھر وہ مسکان جو ہونٹوں کے قریب آنکھوں سے نکل کر امرود کے شہد کی سی مٹھاس بن کر ادھر ادھر اس کے گرد رہا کرتی تھی۔ اس کی کمر کا لوچ۔ میں سوچا کرتا تھا وہ ہاتھ لگانے سے بس یوں کچی کلی کی طرح دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ پر ایک شام جب پنگھٹ سے واپس آتے ہوئے راہ میں گلی سے آگے بڑھ کی داڑھیوں کے قریب اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے گھڑا میرے سر پر دے مارا اور تن کر یوں کھڑی ہو گئی گویا اس میں کسی چیتے کی طاقت اور کسی شیر کی بہادری ہے۔ میں نے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا سارا دھن جاتا دیکھ کر کہا تھا۔ سنتو تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو واہ گرو کی قسم تم مجھے بڑی ہی اچھی لگتی ہو۔ تو اس نے کہا تھا جوان سرداری کے نشے میں نہ رہنا بھلے آدمیوں کو دوسروں کی بہو بیٹیاں بھی عزت دار لگا کرتی ہیں۔ تم نے مجھے سمجھا کیا تھا۔ اور تب مجھے معلوم ہو تھا کہ سنتو کچی کلی کی طرح ٹوٹتا نہیں

سکتی تھی۔ وہ تو چٹان کی طرح سخت اور کسی رانی کی طرح باوقار تھی۔ مجھے وہ شام کبھی نہیں بھول سکتی۔ اگر مجھے یاد نہ رہے تو بڑ کی ان لمبی لٹکتی داڑھیوں کو یاد ہوگا کہ میں نے سنتو کے پاؤں پر سر رکھ دیا تھا اور اس نے اپنے پاؤں سمیٹ کر ایک آن سے میری طرف دیکھے بنا گھر کی راہ لی تھی۔ دوسرے دن جب ہم سب روز کی طرح تاڑی پی کر باغ میں گپیں مار رہے تھے تو تیجے نے کہا تھا "یار رات میں سنتو سے ملنے املی کے باغ میں گیا تھا" تو میں نے اس کے منہ پہ ایک زوردار تھپڑ مار دیا۔ تیجے نے کرپان نکال لی اور قریب تھا کہ ہم دونوں لڑنے لگیں دوسروں نے درمیان میں پڑ کر صلح کروا دی تھی۔ تیجا میری پھوپھی کا اکلوتا لڑکا اور میرا ہم عمر تھا آہستہ آہستہ لڑکوں میں یہ بات پھیل گئی کہ میں سنتو پہ مرتا ہوں اس کا دیوانہ ہوں۔ سب مجھ پہ ہنستے مجھے چھیڑتے پر تیجا کبھی مجھے کچھ نہ کہتا۔ بس آنکھیں جھکا لیتا سیٹی بجاتا یا کہیں ادھر ادھر دیکھنے لگتا بچپن کے باوجود نہ جانے کیوں تیجے کی اس بات سے میرے دل میں گرہ سی پڑ گئی۔ ہم دونوں بڑے ہوتے گئے۔ دوڑوں کے مقابلوں، میلوں ٹھیلوں میں ہم دونوں کئی بار اکٹھے گئے مگر ہمارے درمیان ہوا جیسے تیغ بستہ رہتی۔ اس نے اور لڑکوں کی طرح کبھی مجھے نہیں چھیڑا۔ سنتو بیاہ کر اپنے سسرال چلی گئی۔ سال دبے قدموں ہمارے قریب سے نکل گئے اور جب وہ دو بچوں کو لے کر گوبندی سے ملنے ہمارے گھر آئی تو میں نے اسے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور اس نے بھی بنا جھجک کے مجھ سے باتیں کیں۔

اُن دنوں آموں پہ بُور آ گیا تھا۔ کوئل رات کے وقفوں میں کوہو کوہو بولتی اور ہوا پر بڑی سوندھی پیاری اور ان جان خوشبوئیں تیرتی رہتیں۔ رہٹ چلتے اور گادی پر بیٹھا لڑکا ہیر گاتا رہتا۔ ہیر اپنے دیس کا پیار ہے جوان۔ ہیر اپنی زندگی کا حسن ہے اور رانجھا اس زندگی کا عشق ہے۔ یہ محبتیں جو سنتو سے پہلے بھی زندہ تھیں اور اس کے بعد بھی زندہ رہی ہیں۔ دو بچوں کی ماں سنتو سسرال سے میکے آ کر پھر واپس نہیں گئی۔ کیونکہ واہ گرو کی قسم میں نے اسے کاٹ کر اس کے ذرا ذرا سے ٹکڑے کر کے اسی بڑ کی انہی لٹکتی داڑھیوں کے نیچے اسی جگہ دبا دیا تھا جہاں میں نے اس سے کہا تھا "تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو"۔

رات کا کوئی پچھلا پہر ہوگا۔ میں کھیتوں کو پانی دینے جا رہا تھا۔ باری تو اصل میں بلونج کی تھی مگر میں نے اسے کہہ کر اس رات پانی اپنے لیے لے لیا تھا۔ آخری راتوں کا چاند پرانے زمانوں کی طرح آسمان کے کنارے پہ ستاروں کے جھرمٹ میں چمک رہا تھا اور کھیتوں پر پھیلی چاندنی سوئی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ میں نے کھیس کندھے پہ ڈال رکھا تھا اور ہاتھ میں پھاوڑا لیے تیزی سے گاتا چلا جاتا تھا۔ مندر کے قریب موڑ سنسان سا ہے اور وہاں سادھو کی

کٹیا عرصے سے خالی پڑی تھی جب کبھی کوئی مہاتما ادھر سے گزرتے تو بس اسے چند دنوں کے لئے آباد کر جاتے پھر ویرانی ہوتی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ سامنے سے تیجا آ رہا ہے۔ وہ بنا کچھ کہے میرے پاس سے گزر گیا چند قدموں پر نمبردار کے مکان کی وجہ سے وہ موڑ آج بھی اس طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جب میں دوبارہ سامنے آیا ہوں تو میں نے سنتو کو اس کٹیا سے نکل کر تیزی سے اپنے گھر کی طرف جاتے دیکھا۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو میں دھوکا کھا جاتا مگر یہ سنتو کی چال تھی یہ اس کی چوٹی تھی اس کے جسم کے رنگ ڈھنگ اور پھر اس کی خوشبو۔ میں کہتا ہوں جوان ساری عمر مرد ایک ایسی ہی ان جانی خوشبو کو ڈھونڈھتا نہ جانے کتنی عورتوں میں اسے پانا چاہتا ہے۔ وہ خوشبو جو روحوں کی پاکیزگی اور تپر کے حسن سے پیدا ہوتی ہے اور جو انسان کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور فضا میں ڈولتی ہے۔ مگر تم یہ سب سن کر کیا لوگے۔ میں تو سنتو کی بات کر رہا تھا۔ بڑ کی داڑھیوں کے قریب جا کر میں نے اسے پکارا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں اس کا کوئی نہ تھا مگر وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ تم نے مجھے دھتکار کر تیجے کو پسند کیا تھا۔ تم ماں بن جانے کے بعد بھی ابھی اچھے برے کو نہیں پہچان سکی ہو۔ میں نے تمھارے نام سے اپنا سینہ آباد رکھا تھا اور اس نے واہ گرو کی قسم اس نے داڑھیوں کے اندھیرے میں جب چاند چمک رہا تھا میرے منہ پر تھوک دیا تھا اور کہنے لگی تم اس کی جوتی کی برابری نہیں کر سکتے تم تو کتے کے پلے ہو جو لٹکتے ہوئے پلو کو دیکھ کر مالکن کے پیچھے چوں چوں کر کے چلتا ہے۔ اور واہ گرو کی قسم پھر غصے نے مجھے پاگل بنا دیا۔ مجھے صرف یہ سدھ رہی کہ میرے ہاتھ میں پھاوڑا ہے اور سنتو نے میرے منہ پر تھوک دیا ہے۔ جب مجھے ہوش آیا تو سنتو ادھ موئی میرے پاؤں کے قریب پڑی تھی اور میں اس پر زور زور سے وار کر رہا تھا۔ میرا غصہ ہولے ہولے ٹھنڈا ہونے لگا اور میں نے ایک ایسے آدمی کی طرح جو تیزی اور جلدی سے کوئی ضروری کام کر رہا ہو اپنی ساری طاقتوں کو اکٹھا کر کے سنتو کی لاش کے ٹکڑے کئے۔ نہ جانے تیزی اور کام کرنے کی طاقتیں کیسے اکٹھا ہو گئی تھیں کہ میں نے صبح ہونے سے پہلے پہلے ان ٹکڑوں کو دبا دیا جگہ برابر کر دی اور خود کھیتوں کو پانی دے کر نہر کے کنارے بیٹھا گاتا رہا۔ میری انگلیوں میں سنتو کے جسم کی نرمی بس گئی تھی۔ زندگی میں نہیں تو موت کے بعد سہی میں نے انگ انگ اس کے جسم کو چھوا تھا۔ اس گلابی پھول کی خوشبو سونگھی تھی ان ریشمی بالوں کو خون میں بھگو کر چوما تھا سنتو زندگی میں میری محبوبہ تھی وہ مرنے کے بعد بھی میری محبوبہ رہی۔

"دوسری صبح شور مچ گیا۔ سنتو کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کے نام پر گالیاں پڑتی رہیں اس کے ماں باپ

شرم سے منہ چھپا کر راتوں رات کسی دوسرے گاؤں چلے گئے اور سنتو کا نام ہمارے گاؤں سے مٹ گیا۔ میرے دل میں ہر وقت ایک غم تھا جو گھن کی طرح میری روح کو کھا رہا تھا۔ یہ غم نہیں کہ میں نے سنتو کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے کر دیئے تھے یہ غم کہ اب سنتو کہاں ہے۔ میں ہر رات سپنے میں اسے دیکھتا مغموم صورت بنائے بال کھولے وہ آتی اور میرے پاؤں کے قریب بیٹھ جاتی۔ پھر حسرت سے میری صورت کو تکتی رہتی اور آہ بھر کر اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگتی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ جاتی۔ ان سپنوں نے مجھے اتنا پریشان کر دیا کہ میں جو سنتو کی موت کے بعد کھیتوں کو پانی دے کر نہر کے کنارے بیٹھا گاتا رہتا تھا سونے سے ڈرنے لگا۔ باپو نے میری یہ حالت دیکھ کر مجھے رام نگر جہاں میرا چچا رہتا تھا بھیج دیا۔ چاچے کے پانچ لڑکے بڑے ہی مضبوط جسموں والے اور بہادر جوان تھے۔ انھوں نے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ کی مگر نیند سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ سادھوؤں، سنتوں، مہاتماؤں اور جادو اتارنے والوں نے سب جتن کئے اور میں روز بروز کمزور ہوتا چلا گیا اور چھ ماہ کے بعد میں اسی طرح پریشان حال گاؤں لوٹ آیا۔

"اور تب میں نے اندازہ کیا، میں نے دیکھا کہ گوبندی کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر یوں ہی مسکراہٹ کھیلتی تھی۔ اس کی لمبی چوٹی میں بھی ناگن کی سی مستی تھی۔ اس کے پاؤں بھی زمین پر یوں پڑتے تھے جیسے روئی کے گالے ہوں۔ وہ بھی خزاں سے ناآشنا پھول تھی۔ ڈیوڑھی سے اندر گھسا ہوں تو سب سے پہلے بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ مجھے ویر کہا کرتی تھی۔ ارے تم چھ ماہ میں کتنی بڑی ہو گئی ہو۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میرا دل یکایک اس کے لئے نرمی ملائمت اور محبت سے بھر گیا۔ وہ میری اکلوتی بہن تھی اس کے پاؤں میں گھر بار لگ گئے تھے۔ کام کرتے ہوئے مڑ کر وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ ویر تم اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو، اتنے پیلے کیوں ہو گئے ہو۔ ماں کے ساتھ ساتھ وہ بھی میری ٹانگیں دبا رہی تھی، میرا سر دبا رہی تھی اور میری بیوی کی طرف دیکھ کر پیار سے مسکرا بھی رہی تھی۔ میری بیوی جیتو گھونگھٹ کی اوٹ سے سب سے نظریں بچا کر میری طرف دیکھ لیتی اور پھر گردن جھکا کر کام کرنے لگتی۔ اور وہ میٹھی نگاہیں میرے جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھیں۔ اس لئے کہ وہ نگاہیں مجھے پھر سنتو کی یاد دلا رہی تھیں۔ میں زندگی بھر ایک لمحے کے لئے اسے نہیں بھلا سکا۔

"غموں اور دکھوں مصیبتوں اور گناہوں کے بوجھ تلے دبا میں اسے کبھی نہیں بھول سکا۔ وہ آج بھی ٹبہ کی الکتی داڑھیوں کے نیچے زندہ ہوگی، کروٹیں لے رہی ہوگی اور تیجے کے لئے بے چین ہوگی۔ مجھے کبھی نہیں یہ سمجھ آیا، آخر تیجے میں کیا تھا، اس کی شکل پر مجھے ہمیشہ آوارگی اور بدکاری لکھی ہوئی دکھائی دی ہے، میں نے اسے کبھی آنکھ

بھر کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

"شام کو میری پھوپھی اور خاندان کے اور لوگ ملنے آئے اچھا خاصا میلہ، ساتھ تیجے کی بیوی بھی تھی۔ اس کی بہن بھی تھی۔ نئی بیاہی بہوئیں کنواری لڑکیاں۔ بوڑھی عورتیں جوان لڑکے بچے۔ گاؤں میں ملنے والے جاننے والے سارا گاؤں ہی امڈ آیا تھا۔ گاؤں والوں کو یوں بھی ایک دوسرے سے بہت پیار ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں تیجا آیا۔ سر پہ بڑے تیز رنگ کی پگڑی باندھے گلے میں ہار پہنے بڑا بانکا لگ رہا تھا آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میرا حال پوچھا چاچے کی رام نگر کی اور اس کے بیٹوں کی خیریت دریافت کی۔

"گو بندی ادھر ادھر پھرتی جیتو کے ساتھ آنے والوں کی خاطر تواضع کر رہی تھی۔ دودھ کا گلاس لے کر وہ تیجے کی طرف بھی آئی۔ گلاس پکڑاتے ہوئے میں نے دیکھا دونوں کی انگلیاں ٹکرا گئیں۔ گو بندی نے مسکرا کر تیجے کو دیکھا اور تیجے نے ایک لمحے کے بعد گلاس لے لیا۔ میں لیٹا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ خون ایک سنسناہٹ سے میری رگوں میں چلنے لگا جیسے جسم میں کسی نے بھٹی جلا دی ہو۔ میرا ہاتھ بار بار اپنے پہلو میں لٹکتی ہوئی کرپان کی طرف جاتا۔ مگر میں رک جاتا۔ مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ بڑی بوڑھیاں میرے سر پہ ہاتھ پھیرتی مجھے دعائیں دیتی اور ماں کے اکلوتے لڑکے کے لئے دعائیں کرتی بڑے دروازے سے نکل جاتیں۔ لڑکیاں بچے بہوئیں، میلہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا۔

"چاندنی چھٹکی ہوئی چاندنی تھی۔ صحن میں ایک طرف بندھی دس بارہ بھینسوں گایوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں ٹن ٹنا اٹھتیں، جب وہ چارہ کھاتے کھاتے سر ہلاتیں یا ایک دوسرے سے زیادہ کھانے کی کوشش میں آگے بڑھ کر منہ مارتیں۔ میں چارپائی پہ لیٹا ہوا تھا اور میری آنکھیں گو بندی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ تیجا سب کے جانے کے بعد بھی بیٹھا ہوا تھا اور چارپائی پہ بیٹھا آہستہ آہستہ ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

"میں نے کہا۔ یار بڑی موج میں ہو۔ تو اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور کوئی جواب دیئے بنا کچھ گنگنانے لگا۔ پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ اچھا بھئی نرائن سنگھ میں چلتا ہوں۔ پھوپھی جو ماں اور جیتو کے ساتھ بیٹھی کسی کی بہو کا قصہ کہہ رہی تھی، کہنے لگی تیجے تو گھر چل میں آجاؤں گی۔ مگر تیجا وہاں کھڑا رہا بے مقصد ادھر ادھر دیکھتا رہا اور گنگناتا رہا۔ مجھے ہر گھڑی غصہ آ رہا تھا آخر یہ اب جاتا مرتا کیوں نہیں۔ یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ گو بندی بھینسوں کی ناند کے قریب کھڑی کسی بڑے ضروری کام میں الجھی ہوئی لگتی تھی، اور کسی طرف بھی دیکھ نہیں رہی تھی۔ پھر اس نے زور سے کہا۔

"ماں گھڑے میں پانی کم ہے اگر کہے تو جیتو کے ساتھ جاکر پنگھٹ سے پانی لے آؤں"۔ اور ماں نے اس طرح ہی باتوں میں الجھے پھوپھی سے کوئی کہانی سنتے کہہ دیا۔ "ہاں جاؤ تم دونوں لے آؤ"۔ پھر میں نے جیتو اور اپنی بہن گوبندی کو گھڑے اٹھا کر باہر نکلتے دیکھا۔ یہ سارا تماشا میری نظروں کے سامنے ہو رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے صدیوں پرانا ایک بھوت ہوں جسے کہیں چین نہ ملا۔ جس نے پاتال کی گہرائیوں اور آکاش کی بلندیوں پر بھی اپنے لئے سکھ نہیں پایا اور جواب یہاں صحن میں اپنے گھر کی چارپائی پر لیٹا کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"پھر تیجے نے بھی کہا۔ اچھا بھئی نرائن میں بھی چلتا ہوں، اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آنگن پار کر کے باہر نکل گیا۔ صرف خون کی روانی سے سائیں سائیں کی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں اور کوئی بات مجھے سنائی نہ دے رہی تھی۔ چاند کے قریب تارے کا رنگ آنکھوں میں اترے خون کی وجہ سے مجھے سرخ لگ رہا تھا۔ میں آگ میں بھن رہا تھا اور پھر اتنا لاغر ہونے کے باوجود میں بھی باہر نکل گیا۔ ماں کو اتنی سدھ ہی نہیں تھی وہ مجھ سے کچھ کہتی۔ پھوپھی اور وہ اپنی باتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"پنگھٹ کے قریب جاکر میں نے دیکھا کہ تیجا کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ جیتو اور گوبندی پانی بھر چکی تھیں اور گھڑے اٹھا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں دور سے ہی لوٹ آیا تھا۔ لمبی گلی سے آتے مجھے دیر ہوگئی اور جب میں گھر میں گھسا ہوں تو گوبندی چاٹی میں دودھ ڈال رہی تھی، اور جیتو چولہے میں آگ تیز کر رہی تھی۔ چاندنی تیز اور دیئے کی مدھم روشنی کے سنگم پر کھڑی گوبندی مجھے نہ جانے کیوں اتنی پیاری لگی۔ اس کے چہرے پر طمانیت کا ایک غرور تھا، ایک ایسا جذبہ جس کی سمجھ مجھے نہیں آئی۔ اس گھڑی مجھے یوں لگ رہا تھا گویا وہ دنیا کی ساری حسین عورتوں کی سردار ہو اور جیتو، سنتو سب اس کے سامنے پانی بھرنے والی کہاریاں اور اس کے ساتھ ہی تیجے کے خلاف پرانا غصہ میری رگوں میں گرم پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گھوم رہا تھا۔ اور سپنوں میں رونے والی سنتو کی صورت مجھے چولہے کی آگ کے شعلوں میں نظر آنے لگی، جیسے وہ ہنس رہی ہو، اس کے آنسو خشک ہو چکے ہوں۔

"پھر رات اور گہری ہوگئی اور کام ختم کر کے گوبندی نے زور سے کہا۔ ماں آج میں پھوپھی کے گھر جا رہی ہوں۔ وہاں ساری رات چرخہ کاتوں گی مجھے میرے حصے کا تیل دے دے۔ اور ماں نے کہا اچھا تیری پھوپھی بھی کہہ گئی ہے۔ تیرے ویر کو کھانا دے لوں پھر میں بھی چلتی ہوں۔ جیتو گھر رہے گی اور جیتو نے گھڑے میں سے پانی ڈالتے ذرا سا سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ مگر اس رات تو میں صرف گوبندی کو دیکھ رہا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ نہیں ماں میں گوبندی کو اس گھر

نہیں جانے دوں گا جہاں تیجا ہے۔ میں گوبندی کو گھر سے باہر نہیں جانے دینا چاہتا میں چپ رہا اور گوبندی کے تو گویا پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹِک رہے تھے۔ پھر پونیوں کا ڈھیر اٹھا کر اس نے ایک کپڑے میں باندھا۔ میرے پاس آکر کہنے لگی "ویر تیرا جی کیسا ہے۔ دودھ پی کے آرام سے سونا۔ ویر تم کتنے دبلے ہو گئے ہو۔ تمھیں کیوں یہ دکھ نہیں چھوڑتا۔" اس کی آواز میں اتنی اداسی تھی اتنی سچائی تھی کہ اگر میری رگوں میں خون کی جگہ آگ نہ ہوتی تو میں گوبندی کو گلے سے لگا لیتا اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرتا اور کہتا "میری ننھی بہن میں صرف تیری دعا سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔" مگر میں پتھریلے دل کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ میں نے اسے ایک لفظ بھی نہ کہا اور وہ ماں کے ساتھ پھوپھی کے گھر چلی گئی۔

جیتو نے لمبا گھونگھٹ ہٹا کر بڑے پیار سے کہا اندر چلو جی اب تو بہت ٹھنڈ ہو گئی ہے۔ مگر مجھے اس ٹھنڈک کا ہوش کہاں تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور یونہی بیٹھا رہا۔ رات نیلے آکاش کی چنری اوڑھے دھیرے دھیرے پائل جھنکاتی ستاروں کی آنکھوں سے ہمارے گھر کے خالی صحن کو دیکھ رہی تھی جیسے گایوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹ گونج رہی تھی اور دہلیز پر بیٹھی جیتو اپنا سر دروازے سے لگائے میرے اندر جانے کے انتظار میں نہ جانے کب کی سو چکی تھی۔ اُن دنوں دل کتنا دیوانہ تھا۔ میرے خون میں موت کا راگ تھا صرف موت کا۔ میرے منہ کا مزہ کڑوا تھا جیسے مجھے خون کی پیاس لگ رہی ہو۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میرے اَن جانے قدم پھوپھی کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ نیچی حویلی کی دیوار کے قریب جا کر میں نے دیکھا گوبندی گھڑوں کے قریب کھڑی پانی پی رہی تھی اور تیجا بھی اس کے قریب کھڑا تھا اس سہانی اور تصویر کی سی رات میں میری بہن گوبندی اور تیجا۔

"کمرہ لڑکیوں اور عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ سو رہی تھیں۔ دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں چرخہ خون کی گھوں گھوں تھی جو ایک موت کا راگ معلوم دیتی تھی اور میٹھے مدھر سپنوں کے سے گیتوں سے ہوا بوجھل تھی۔ میں دہلیز پہ کھڑا ہو گیا۔ اور گوبندی جو ابھی چرخے کے سامنے آکر بیٹھی ہی تھی گھوم کر دیکھنے کے بعد کھڑی ہو گئی۔ "کیوں ویر کیا بات ہے؟" میری شکل دیکھ کر اسے اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی ہو گی۔ ایک عورت نے جسے ہم سب ماسی کہتے تھے کہا "نرائن سنگھ بچوں کی طرح ماں بہن کے پیچھے آیا ہے اور وہ ہنس پڑی" "ماں کہاں ہے؟" میں نے بس یونہی پوچھا اور ذرا اونچے ہارے کے پاس سوئی ماں کو پھوپھی نے کہا — بھابھی نرائن سنگھ آیا ہے پوچھ تو کیا بات ہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگی کیوں نرائن جی تو اچھا ہے لال تو کیسا پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے کسی کو کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے گوبندی کی طرف دیکھتا رہا جس کا رنگ دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں مٹی ہو رہا تھا اور جو اپنے چرخے کے پاس کھڑی تھی۔ پھر میری ممیری چچیری بہنیں بھی پریشان ہو گئیں۔ سب نے چرخے

چھوڑ دیئے اور اٹھ اٹھ کر دہلیز میں آ کھڑی ہوئیں۔ نرائن کیا بات ہے؟ نرائن ویر تیرا جی کیسا ہے؟ ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور باہر آ گئی۔ میں نے کہا گوبندی کو بھی ساتھ لے لو۔ نانے کے گھر سے بلاوا آیا ہے۔ شاید اسے آج رات جانا پڑے اور ماں حیران سی ہو کے بولی چل گوبندی آ گھر چلیں۔ سب کو دہلیز میں کھڑا چھوڑ کر ہم سب چلنے لگے تو پھوپھی کہنے لگی کیوں بھابی میں بھی آؤں کیا کوئی بڑے فکر کی بات ہے؟ اور ماں کی بجائے میں نے جواب دیا چھاؤنی سے نائی آیا ہے باقی بات پھر بتاؤں گا۔

گوبندی ہمارے پیچھے پیچھے ہولے ہولے چل رہی تھی جیسے وہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہو اور اسے سنبھل سنبھل کر قدم دھرنے کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح کبھی ادھر ادھر دیکھتی اور آگے چلنے لگتی۔ اس کا چھوٹا سا دل نہ جانے کتنے زور سے دھڑک رہا ہوگا کیونکہ اس کے بعد تو مجھے اس سے پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے اس کے گلے پر اپنا پاؤں دھر دیا اور وہ بے کس جانور کی طرح دیر کہنے کی کوشش کرتی رہی اس نے ہاتھ پاؤں بھی نہیں مارے۔ یوں ایک کیڑے کی طرح جسے کوئی ذرا سی انگلی سے روند دے۔ میں نے گوبندی کو ہٹا دیا۔ اپنی اس بہن کو جس کے بعد آج تک مجھے کسی نے ویر نہیں کہا۔ ان آنکھوں کی حسرت مجھے کبھی نہیں بھولی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں۔ جیتو کی آنکھیں خوف سے کھلی ہوئی تھیں اور ماں یوں گم بیٹھی تھی جیسے پتھر ہو۔ اگر ان دونوں میں سے ایک بھی ذرا سی حرکت کرتی تو اس کا انجام بھی شاید یہی ہوتا۔

"اگر تیجا اتنا باںکانہ ہوتا تو شاید میری کہانی مختلف ہوتی۔ میری زندگی کے قصے میں اور رنگ ہوتا۔ میں نے یہ زندگی جو ایک زخمی جانور کی طرح پھر کر گذارنے کی بجائے اور طریقے سے گذاری ہوتی۔ اگر تیجا عورتوں اور لڑکیوں کے دلوں میں بند باندھنے اور انہیں بے بس کرنے والا جادو نہ جانتا ہوتا تو آج گوبندی زندہ ہوتی۔ میرے لئے بھی دنیا میں خوشیاں ہوتیں۔ مگر گوبندی کو میں نے مار دیا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میں نے اسے اناج کی کوٹھیوں سے بھرے کمرے میں دبا دیا اور پیپل کی چھاؤں تلے سے گوبندی کی ڈولی کبھی نہ گذری ہمارے آنگن میں سہاگ بھرے گیت کبھی نہ گونجے۔ ہمارے دالانوں میں مہندی کی خوشبو کبھی نہ اڑی۔ گوبندی کے بعد سے یہ حویلی ویران ہے۔ اس کے بڑے بڑے دالان ڈھولک کی تھاپ کو سننے کا برسوں انتظار کرتے رہے اور پھر بوڑھے ہو گئے۔

"اگر تیجے کو میری اس کمزوری کا یقین نہ ہوتا کہ میں اس سے جلتا ہوں تو شاید آج وہ بھی اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر نیلی وصول اڑاتا ان چوڑی گلیوں اور بڑ کی لٹکتی داڑھیوں کے نیچے سے گزرا کرتا۔ مگر اسے میری اس کمزوری کا یقین تھا اور اسی لئے اپنی شکست کو روز روز اس کی آنکھوں میں پڑھنے کی بجائے میں نے اسے بھی مار دیا۔

"نہر کے پل کے قریب گھنے درختوں کی وہ رات کبھی نہ بھولے گی۔ جب اماوس اپنی ساری تاریکیوں سمیت گذر رہی

تھی اور تیجا ماہیا گاتا گھوڑی کو دلکی چلاتا بڑے ٹھاٹ سے گھر آ رہا تھا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ اس نے دوسرے گاؤں میں پیٹ بھر کر تاڑی پی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے۔ شاید اس رات گاؤں کے کسی موڑ پر کوئی سنتو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شاید اس گھڑی بھی کسی دالان میں نکل کر کسی گوبندی نے پانی پینے کے بہانے اس سے بات کرنی تھی مگر میں نے ان سب کو انتظار کرنے دیا۔ میں نے اس پر پیچھے سے وار نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے للکارا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا آج پچھلا بقایا ادا کر دو اور اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"نرائن سنگھ واہ گرو کی قسم ساری زندگی میں تو نے آج ایک بات کام کی کی ہے۔ میں تو کب سے سوچ رہا ہوں۔ اگر تجھ سے حساب کتاب نہ ہو سکا تو کیا ہوگا اور اس نے اپنی لمبی کرپان نکالی تھی اور گھوڑی کو درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ پھر میں بھی اپنی گھوڑی سے نیچے اتر آیا اور ہم خاموش چپ چاپ لڑتے رہے۔ صرف کرپانوں کے ٹکرانے سے اندھیرے میں چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ تیجے کے بازو کی قوت کا احساس مجھے اس رات ہوا تھا۔ اپنی برتری اور غصے کا پتہ بھی مجھے اس رات ہی چلا تھا۔ اس کے ہانپنے کی آواز میرے کانوں میں فتح کے گیت سے بھی زیادہ سہانی ہو کر پڑتی تھی۔ مجھے معلوم تھا میں اپنی باقی ساری زندگی لڑ سکتا ہوں۔ میرے خون کی گرمی اور غصے کی آگ نے مجھے دیو بنا دیا تھا ورنہ تیجے کے سامنے جاتے تو لوگ کانپا کرتے تھے۔ اس نے کہا نرائن سنگھ موت یقینی ہے مگر میں تجھ سے رحم کی بھکشا نہیں مانگوں گا جو جی چاہے کر دو اور اس نے اپنی ساری طاقت صرف کر دی مگر میری کرپان کی کاٹ بڑی گہری تھی۔ تیجا گر گیا اور پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کی گھوڑی رسہ تڑا کر نہ جانے کب کی گھر بھاگ گئی تھی۔ مجھے اس رات کسی کا ڈر نہیں تھا۔ میں نے پہلے نہر سے جی بھر کر پانی پیا۔ پھر کرپان کو مَل مَل کر دھویا اور اس کے بعد اپنی گھوڑی کو کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔ زندگی میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔

"جس رات میں نے تیجے کو مارا ہے۔ میری زندگی کے سارے دکھ سکھ ختم ہو گئے۔ میں بھی اسی رات وہیں مر گیا اور آج تیس سال پہلے کی بات ہے میرا بھوت حویلی کے دالانوں میں یوں ہی چکر لگایا کرتا ہے۔ مجھے کبھی کوئی یاد نہیں آتا پر گوبندی کے لئے میرا جی تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کے بعد سے آج تک مجھے کسی نے دیر نہیں کہا۔ نہ جانے اس کا ننھا سا دل اس رات کس زور سے دھڑک رہا ہوگا۔ یہ راز میں نے تیس سال سینے میں چھپائے رکھے ہیں۔ پر آج ان کے بوجھ سے میرا دل پریشان ہو گیا تھا اور تیس سال میں پہلی بار حویلی کو چھوڑ کر نہر کے اس پل تک گیا تھا جہاں اماوس کی آخری رات ہم نے ایک دوسرے سے ٹکرانے میں اپنے اپنے حساب کتاب سمجھے تھے۔"

ہم سب خاموش تھے۔ نرائن چاچا بجھی ہوئی آگ کرید رہا تھا۔ شاید اسے گوبندی یاد آ رہی تھی۔ ●●

بلونت سنگھ

پُوجا

ارونا کے پیٹ میں کینسر (سرطان) تھا اور اب وہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی تھی۔

رات بڑی حسین اور پرسکون تھی۔ آسمان پر بدر کامل قہقہہ زن تھا اور آس پاس دُور دُور تک ستارے رقصاں تھے ——— موت کے موقعہ پر فضا اتنی خوبصورت ہونی چاہیئے یا بھیانک؟

اب وہ بتیس سال کی تھی۔ اس کی شادی اکیس برس کی عمر میں بابو ہریش چندر سے ہوئی تھی جو بیوی سے آٹھ سال بڑے تھے، اور اس وقت ساڑھے گیارہ بجے، وہ اس کے سرہانے کے قریب بیٹھے تھے

گرمیوں کا موسم تھا لیکن راتیں خوشگوار تھیں، اس وقت وہ وسیع وعریض حویلی کی دوسری منزل پر بنی بارہ دری میں تھے۔ ایک طرف دو کمرے تھے جو ارونا کیلئے مخصوص تھے۔ کمروں کے آگے پچاس فٹ لمبی اور تیس فٹ چوڑی چھتی ہوئی جگہ تھی جس میں اونچی اونچی محرابوں والے بارہ در تھے۔ دائیں بائیں چھت بھی بہت وسیع تھی لیکن برسات کے موسم میں بارہ دری میں سونے کی سہولت ہوتی تھی۔ بابو جی نے یہ پرانی حویلی خریدی تھی۔ انھوں نے سوچا تھا کہ وہ حویلی کی مرمت کرالیں گے، اس کا کچھ حصہ گروا کر پھر سے بنوادیں گے اور پھر خالی زمین پر دونوں لڑکوں کو شادی کے بعد رہنے کیلئے چھوٹے چھوٹے بنگلے بنادیں گے۔

حویلی سے پرے لڑکوں کا اسکول تھا۔ کھیل کے میدان میں کچھ ورزش کا سامان بکھرا ہوا تھا سفید سفید لکیروں کا چونا ادھر اُدھر پھیلا ہوا تھا ——— اس میدان سے بھی پرے لاریوں کا اڈہ تھا ——— بابوجی کا ایک ہاتھ بیوی کے بالوں پر پھسل رہا تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ یہ سنسار بھی تو عجیب کھیل گھر ہے، یہاں لوگ اکثر کیسے کیسے بھیانک اور ظالمانہ کھیل کھیلا کرتے ہیں اور پھر یانی

کے بُلبلوں کی طرح معدوم ہو جاتے ہیں۔

معاً اُرونا نے اپنی مندی ہوئی آنکھیں کھول کر شوہر کی طرف دیکھا "بس آج کی رات ہے"

بابو ہریش چندر نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا۔ یہ بات ان کے دل میں تیر کی طرح تراز و ہو گئی۔ یہ درست تھا کہ رات کے بارہ ایک بجے تک وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں نہیں پائے جاتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ ـــــ شاید وہ کھوئے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"نہیں ارونا! میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا"

ارونا جانتی تھی کہ وہ راتوں کو کہاں رہتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیوں باہر رہتے تھے؟ نہ کبھی اس نے شکایت کی اور نہ اس کا سبب جاننے کی کوشش کی۔ آج بھی اس کے لہجہ میں شکایت نہیں تھی، بلکہ یوں لگتا تھا جیسے شوہر کو دلاسہ دے رہی ہو کہ آج کی رات کے بعد.....

وہ حسین نہیں دل کش تھی سب سے زیادہ دلکش اس کی آنکھیں تھیں۔ شاید اس سے بھی دل کش اس کا گھریلو پن تھا۔ ہریش جی نے دوسروں کے گھروں کے جھگڑے سنے تھے لیکن ان کے اپنے گھر میں ٹرا و بال کبھی نہیں ہوا۔ اب مرنے والی کے اوصاف نظر آنے لگے تھے۔ اس کے چار بچے تھے۔ دو لڑکے دو لڑکیاں۔ ان کی بہت اچھی دیکھ بھال کی تھی لیکن ـــــ بات ان کے مونہہ تک پہنچ کر رہ گئی۔ کیا وہ ارونا سے ایک سوال کریں؟ لیکن جس بات کا انھیں یقین تھا اسے پوچھنے کا کیا فائدہ؟ ـــــ پھر بھی یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ اپنے من کا بوجھ ہلکا کر لینے میں کیا ہرج تھا۔ ارونا نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس سے ان کے دل میں میل رہ جائے..... تو پھر یہ شکایت بھی کیوں رہ جائے......

انھوں نے بیوی کے زرد چہرے کو نرم نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا "اب درد تو نہیں ہو رہا؟"

ڈاکٹروں نے ایک برس پہلے بتا دیا تھا کہ سرطان کا درد بہت ہی شدید ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ان کی بیوی کی جان بچ نہیں سکتی۔ آپریشن بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوا تھا۔ بے رنگ اور بے رس ہونٹوں سے مسکراہٹ پھوٹ کر ارونا کے دبلے چہرے پر پھیل گئی "نہیں اس وقت

درد بالکل نہیں ہے ——— آپ کو معلوم نہیں کہ جب موت بہت قریب آجاتی ہے تو جاہے جیسا بھی مرض ہو دور ہو جاتا ہے..... میرا مطلب ہے کہ درد بالکل نہیں ہوتا ——— "

چونکہ بابو ہریش کو بہت پہلے سے علم ہو چکا تھا کہ ارونا اس مرض سے جاں بر نہیں ہو سکے گی، انھوں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس عظیم سانحہ کے لئے تیار کر لیا تھا ——— انھوں نے اپنے گرم ہاتھوں میں بیوی کا ٹھنڈا ہاتھ لیتے ہوئے پوچھا۔" ارونا! کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم محبت کسی اور سے کرتی تھیں، لیکن تمہاری شادی مجھ سے ہو گئی؟...... میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں کہا لیکن آج..... "

وہ جانتے تھے کہ ارونا جھوٹ موٹ کہہ دے گی کہ یہ غلط ہے۔ اس جھوٹ کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود ان کے دل کو ایک گونا تسکین حاصل ہو جائے گی۔ ارونا جھوٹ بولتی نہیں تھی لیکن اس معاملے میں ———

"یہ ٹھیک ہے۔"

یہ سن کر ہریش بابو کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہوگئی۔ وہ جانتے تھے کہ ارونا سچ بول رہی تھی لیکن ان کے دل نے رو کر کہا کہ ارونا نے سچ کیوں بولا کم از کم جاتے جاتے تو ———

ارونا کا جواب اور جواب دینے کا انداز اتنا قطعی تھا کہ ہریش بابو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑکھڑا کر اوندھے مونہہ گر پڑے ہوں ——— یہ وحشت کیوں؟ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ارونا کبھی جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اگر وہ سچ سننے کو تیار نہیں تھے تو حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

آگے بولنے سے وہ ڈر رہے تھے۔ انھیں خوف اس بات کا تھا کہ نہ جانے ان کی آواز اور لہجہ کیسا ہو لیکن پھر بھی انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔" تمھاری مرضی کے خلاف؟"

"نہیں۔"

نہیں؟ ——— ہریش بابو نے سوچا کہ اب کے ارونا غالباً انھیں بیوقوف بنانے کی سوچ رہی ہے۔

اردنا نے اعتراف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "جب مجھے معلوم ہوا کہ میرا رشتہ آپ سے طے ہونے والا ہے تو میں نے ایک سہیلی کے ذریعہ سے اپنی ماں کو اپنے ارادے سے مطلع کر دیا۔ ماں نے پتاجی کو بتا دیا۔"

"تم 'اسے' کب سے جانتی تھیں؟"

"دو ڈھائی سال سے۔ وہ بڑے بھائی کے ساتھ ہمارے گھر آتا تھا۔ ہمارے گھر میں بچوں کو کافی آزادی ضرور حاصل تھی لیکن اتنی نہیں کہ لڑکیاں گھر سے باہر جاکر دوستوں سے مل سکیں۔ اس لئے ہمارے تعلقات گھر کی چار دیواری تک محدود رہے ــــ تو..... جب پتاجی کو میرے ارادے کا علم ہوا تو وہ ایک روز دن ڈھلے مجھے اپنے کمرے میں لے گئے، اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ ہمیشہ یونہی کیا کرتے ہیں۔ خواہ لڑکے کو خواہ لڑکی کو جب کبھی کوئی اہم بات سمجھانی ہوتی تھی تو اسے الگ تھلگ اپنے کمرے میں لے جاکر سمجھاتے۔ میں نے انھیں برسرِ عام بچوں پر چلّاتے کبھی نہیں دیکھا...... میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے کس موضوع پر بات کرنے والے ہیں لیکن میں نے بھی پکّا ارادہ کر رکھا تھا کہ ثابت قدم رہوں گی....."

ہریش بابو نے بطورِ خاص بیوی کی طرف دیکھا۔ "پکّا ارادہ کر رکھا تھا؟"

"جی ــــ تو جب ہم کمرے میں تنہا کھڑے تھے تو انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ 'بیٹھو اردنا' میں بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ آخر بولے "بیٹی تم جانتی ہو کہ میں تمھارا رشتہ طے کرنے والا ہوں۔"

"جی۔"

"لیکن تمھیں یہ رشتہ پسند نہیں۔"

"یہ بات نہیں، کیونکہ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"اس لئے کہ تم کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

"جی۔"

"راکیش سے۔"

"جی۔"

"ہماری گفتگو یہاں تک پہنچی تو پتاجی پھر چپ چاپ ٹہلنے لگے —— پتاجی سے اس موضوع پر بات چیت کرنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا اور بدن کانپ رہا تھا میری جھکی ہوئی آنکھیں گود میں رکھے ہوئے ہاتھ پہ گڑی ہوئی تھیں —— انھوں نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔ اگر میں اس کا سبب پوچھوں تو غالباً یہی کہوگی کہ تم محبت کی وجہ سے یہ قدم اٹھا رہی ہو۔"

"جی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں کے تعلقات سرسری ملاقاتوں تک محدود رہے ہیں۔"

"جی۔"

"اس کے علاوہ تم دونوں......"

"جی ہمارے تعلقات بالکل پوتر رہے ہیں۔"

"شائد عہد و پیمان ہوئے ہوں گے۔"

"جی نہیں —— لیکن میرا یہی ارادہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی یہی چاہتے ہیں۔"

اس پر پتاجی پھر کچھ دیر چپ رہے تب بولے۔" ارونا میں سمجھتا ہوں کہ راکیش کے بارے میں تمھاری معلومات بہت کم ہیں۔ سب سے پہلی بات تو تمھیں یہ جاننی اور سمجھنی چاہئے کہ عورت کے لئے شادی کی بنیاد محبت نہیں.... پوجا ہونی چاہئے۔ آج جو شخص عورت یا مرد ہمیں پیارا لگتا ہے۔ کل کو بُرا بھی لگ سکتا ہے لیکن پوجا کی بھاونا بہت گہری ہوتی ہے۔ پوجا سے میری مراد یہ نہیں کہ عورت ہر روز مرد کے پیروں پر سر رکھ دیا کرے۔ پوجا کا مطلب ہے گہرا احترام، یہ احترام مرد کے دل میں بھی اپنی عورت کے لئے ہونا چاہئے...... یہ نہ سمجھنا کہ میں پرانے خیالات کا حامی ہوں۔ لیکن میری زندگی کا یہی نچوڑ ہے۔ شادی زندگی بھر کا ساتھ ہے جسے پورے طور سے نبھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ راکیش کے بارے میں جو نتیجہ میں نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی لڑکی پر فریفتہ ہو سکتا ہے، اس سے محبت کر سکتا ہے لیکن اس کا احترام نہیں کر سکتا اور زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے جس سنجیدگی اور جس احساس ذمہ داری کی ضرورت ہے وہ بھی اس میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے میری خواہش یہ ہے کہ ایک بار پھر تم اپنے فیصلے پر غور کر لو اس کے بعد اگر تم یہی محسوس کرو کہ راکیش

کو ہی جیون ساتھی بناؤ گی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا ــــــ میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ میرا چنا ہوا لڑکا راکیش کی طرح ہیرو تو نہیں دکھائی دیتا لیکن وہ صدق دلی سے تمھارا احترام کریگا اور زندگی کی گاڑی کو بحسن وخوبی چلانے کی اہلیت رکھتا ہے.... اب اس مسئلہ میں سارے پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کرنا تمھارا کام ہے"

"اتنا کہہ کر پتاجی کمرے سے باہر نکل گئے"

اروناؔ نے یہ سب باتیں اٹک اٹک کر رک رک اور ہانپ ہانپ کر کہیں... اور پھر دونوں ہاتھ شوہر کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولی۔ "میں نے جو فیصلہ کیا وہ آپ کے سامنے ہے"

پیڑوں کی پتیاں تالیاں بجا رہی تھیں۔ اروناؔ کے پپوٹے جھک گئے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ شائد اسے نیند آرہی تھی۔ ہریش بابو نے اس کے گھنے بالوں کو چند لمحوں تک تھپتھپایا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ اروناؔ کے کمرے میں جا گھسے وہ اس کمرے میں شاید ہی کبھی گئے ہوں اور اگر گئے بھی تو انھوں نے کمرے کا جائزہ کبھی نہیں لیا ــــ آج وہ اسے نئی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ وہاں عام گھریلو سامان رکھا تھا۔ کرشن جی کی مورتی کے اوپر دیوار پر ان کا بڑا سا فوٹو چوکھٹے میں جڑا ٹنگا تھا۔ اس پر مرجھائے ہوئے پھولوں کا ہار اب بھی لہرا رہا تھا سست گامی سے قدم اٹھاتے ہوئے انھوں نے ایک بڑے سے چوبی صندوق کا ڈھکن اٹھایا تو وہ سوکھے ہوئے ہاروں سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا..... شائد ان میں وہ ہار بھی دبا پڑا تھا جو اروناؔ نے سسرال میں پہنچ کر پہلی بار تصویر پر لٹکایا ہوگا ــــــ

کیا سچ مچ اروناؔ زندگی بھر ان کی پوجا کرتی رہی تھی؟ کیا وہ محض غلط فہمی کا شکار ہو کر زیادہ تر راتیں بازاری باہوں میں گزارتے رہے تھے؟ ــــ چلتے چلتے وہ اروناؔ کے پلنگ کے قریب پہنچے۔ ایک بار پھر ان کے سامنے اس کی آواز سننے کے لئے بیقرار ہو اٹھے۔ انھوں نے دھیرے سے کہا "اروناؔ!"

کوئی جواب نہیں ملا تو وہ سمجھ گئے کہ اس کا سبب نیند نہیں تھا...... ایک ستون سے ٹیک لگا کر وہ کھوئی کھوئی نظروں سے چاندنی کی مردنی کا جائزہ لینے لگے۔ ●●

سہیل عظیم آبادی

سادھو اور بیسوا

مایا جب اپنی ساس اور نندوں کے ساتھ شانتی آشرم پہنچی تو چند عورتیں اور بھی آچکی تھیں اور سوامی چیتن آنند مہاراج پرارتھنا کے لئے آچکے تھے اور اونچے سے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ بس انتظار تھا کہ کچھ دیر میں وقت ہو جائے تو اپنا بھجن شروع کریں۔ پہلے اس کی ساس کملا دیوی نے سوامی مہاراج کے چرن چھوئے اور پرنام کیا۔ اور مہاراج نے ہر ایک کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسیس دیا۔ سب سے اخیر میں مایا ان کے چرن چھو کر پرنام کرنے بڑھی مگر اس نے جیسے ہی چرن چھونے کو اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے، مہاراج نے اپنے دونوں پاؤں سمیٹ لئے اور اس کا سر چھوئے بغیر اشاروں اشاروں میں اسیس دیا اور کملا دیوی سے مسکرا کر بولے۔

"دیوی بہو تو سچ مچ سندر ہے۔"

پھر مایا سے بولے۔ "اب تم ۔۔۔۔۔"

سوامی جی مہاراج چپ ہو گئے۔ مایا نے سر اٹھا کر ایک نظر سوامی جی کو دیکھا۔ ان کا کھلا ہوا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے تھے۔ سوامی جی کچھ اور کہنا چاہتے تھے۔ مگر کہہ نہیں سکے۔ مایا کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ اپنے دل میں بڑی شردھا اور عقیدت لے کر آئی تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ شانتی آشرم میں پہنچ کر مہاراج کے درشن کر کے، ان کے پرنچن سن کر بڑی شانتی ملتی ہے۔ مگر وہاں پہنچ کر اور مہاراج کا سلوک دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوا کہ [illegible] کے دل کی شانتی مٹ گئی۔ مہاراج نے کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ "اب تم ۔۔۔!" [illegible] بعد مایا نے خود ہی جملہ پورا کر لیا۔ بلکہ کئی جملے بنائے۔ آخر مہاراج یہی کہہ سکتے تھے۔ "اس گھر کی لاج [illegible] نا۔ شریف عورتوں کی زندگی

گزارنا"، اور جانے کیا کیا۔ مہاراج کیا کہنا چاہتے تھے یہ سمجھنے میں مایا کو ذرا بھی دیر نہیں ہوئی۔ وہ سینکڑوں بار ایسے جملے گھر پر اور ڈراموں میں خود بول چکی تھی کہ پورے جملے کے دو لفظ وہ بولے اور سننے والا خود ہی جملہ پورا کر کے سمجھ لے۔ سوامی چیتن آنند مہاراج نے بھی یونہی کہا تھا۔ مایا نے خود ہی جملہ پورا کر لیا اور ان کہے جملے کا ایک ایک لفظ تیر کی طرح اس کے دل میں اتر گیا۔ اس نے آنے سے پہلے سوچا تھا سوامی جی کے درشن کرے گی۔ ان کے چرن چھو کر پرنام کرے گی۔ آشیس لے گی۔ ان کے پر بچن سنے گی اور ان کی پرارتھنا میں شریک ہو گی۔ اور اپنے دل میں شانتی بھر لائے گی۔ مگر سوامی جی کی بات نے وہ تھوڑی بہت شانتی بھی اس کے دل سے چھین لی، جو چند مہینوں میں اس نے حاصل کی تھی۔ اور سب کے سامنے منہ پر طمانچہ مار کر یاد دلا دیا کہ وہ کون تھی۔ اور اگر وہ اپنے آپ کو بھول چکی تھی تو یہ اس کی بے وقوفی تھی۔ اور عقل کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو یاد رکھے۔ پھر بھی اس نے ضبط کیا اور سوچا کہ آ گئی ہے تو پر بچن سن لے اور پرارتھنا کر لے۔ مگر اسے ایسا محسوس ہوا کہ شانتی آشرم میں جمع ہونے والی ساری آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں اور سارے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ اور اگر وہ شانتی آشرم سے فوراً باہر نہیں نکل جائے گی تو اس کا پھیپھڑہ پھٹ جائے گا اور اسی جگہ اس کا دم نکل جائے گا۔ مایا نے جھک کر ساس کے کان میں کچھ کہا اور آشرم سے باہر نکل گئی۔

گھر پہنچی تو مایا نڈھال مسہری پر گر پڑی اور آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ سوامی چیتن آنند بڑے سنیاسی تھے۔ سارے شہر میں ان کا نام تھا۔ بڑے سے بڑا آدمی ان کے درشن ہی کر کے سدھر جاتا تھا۔ بہت سے برباد لوگوں کی زندگی انھوں نے سدھار دی تھی۔ ان کی باتوں میں جادو تھا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی ان کی بات سن لے اور اثر نہ پڑے۔ لوگ کچلی ہوئی روح لے کر ان کے پاس جاتے تھے اور نئی زندگی لے کر واپس آتے تھے۔

مگر مایا کو ایسا معلوم ہوا کہ سوامی مہاراج نے اس کی ہنستی کھیلتی ہوئی روح کو پکڑ کر کچل دیا۔ اور اسی جہنم میں پھینک دیا جس میں چھ مہینے پہلے تک جل رہی تھی۔ وہ بلبلا اٹھی اور اسے اپنی پرانی زندگی کی یاد آنے لگی، جس کو اس نے بھلا دیا تھا، اس کے پتی نے بھلا دیا تھا، ساس اور نندوں نے بھلا دیا تھا مگر سوامی جی نے نہیں بھلایا تھا۔ حالانکہ سوامی جی کو اس کی اگلی پچھلی زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس سے ان کو کیا غرض تھی کہ وہ پہلے کون تھی اور اب کون ہے! سوامی جی کو تو صرف یہ سوچنا چاہیے کہ ان کا کل کا آنے والا دن کیا ہوگا۔ اس نے تو یہ ثابت کر دیا تھا کہ آدمی اچھی زندگی گزارنا چاہے تو بگڑی ہوئی زندگی بھی سدھر سکتی ہے لیکن سوامی جی کے دماغ سے یہ بات اب تک نہیں نکلی تھی کہ پہلے وہ کیا تھی۔ چھ مہینے پہلے تک وہ بیسوا تھی۔ جو ہر رات کسی نہ کسی مرد کے ہاتھ بک جاتی تھی۔ لیکن اس نے کوشش کر کے اپنی زندگی سدھاری تھی اور اب وہ کسی دوسری عورت کی طرح شریف عورت تھی۔

یکایک اس کے خیالوں کا دھارا بدل گیا اور وہ سوچنے لگی تپسیا کس نے کی۔ سوامی جی مہاراج نے یا اس نے، اور اس تپسیا سے تپ کر مکتی کس کو ملی اسے یا سوامی جی کو! اس نے محسوس کیا کہ مکتی تو اسے ملی ہے۔ مہاراج تو اب تک انھیں بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں، جن سے مکتی پانے کے لئے انھوں نے آشرم اور بہت سے دوسرے جال بن لئے ہیں۔ جن سے انھیں کبھی چھٹکارا نہیں ملے گا۔ وہ اسی آشرم، درشن، پرنچن اور پرارتھنا کے چکر میں رہ جائیں گے۔ مگر ان کی روح کو وہ طاقت کبھی حاصل نہیں ہوگی جو کمزور اور تھکی ہوئی روح کو سہارا دے سکے۔

اسے اپنی پچھلی زندگی یاد آنے لگی۔ گزری ہوئی زندگی کا ایک ایک واقعہ یاد آتا گیا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اسے کلکتہ لاکر بیچ دیا گیا اور وہ شہر کے ایک بدنام محلّے کی بند چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے لگی۔ اور اس کی بوڑھی مائی اسے پالنے لگی۔ ماں باپ کے گھر کی زندگی کچھ اور تھی اور اب کچھ اور! دونوں میں بڑا فرق تھا۔ مگر اس نے کبھی کوئی تکلیف محسوس نہیں کی۔ لیکن بوڑھی مائی کبھی کبھی اسے بری طرح ڈانٹتی تھی اور کبھی کبھی بوڑھی مائی اس کے بارے میں دوسری عورتوں سے باتیں کرتی تھی اور اسے اندازہ ہوتا تھا کہ بوڑھی مائی اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا بنا رہی تھی اور جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی جاتی تھی، مائی کی خوشی بھی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ لیکن خود اُسے یہ زندگی پسند نہیں تھی وہ دل ہی دل میں کڑھتی تھی لیکن کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں کو منہ چھپا کر خوب روتی تھی۔ اور ایک دن اس کے حسن اور اس کی جوانی کے چرچے ہونے لگے اور بوڑھی مائی بھی اسے اکیلی چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئی اور اس کی زندگی عجیب ڈھنگ سے گزرنے لگی۔ ویسی ہی جیسی اس محلّے کی دوسری عورتوں کی تھی۔ پسند نہ کرنے پر اسے ہر روز آنے والوں کے انتظار میں بیٹھنا

پڑتا تھا۔

ایک دن آخر اس کی کوٹھری میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی آگیا۔ وہ روپ محل تھیٹر کا مالک تھا اور اسے بہت سی لڑکیوں کی تلاش تھی۔ اس کے ساتھ اور آدمی بھی تھے اور اسے سیٹھ کہتے تھے۔ اس نے مایا کو تھیٹر میں کام کرنے پر راضی کرلیا۔ مایا راضی بھی ہوگئی اور کام بھی کرنے لگی۔ لیکن مایا کو معلوم ہوا کہ سیٹھ نام کا سیٹھ تھا۔ اس کی تھیلی خالی تھی اور سارے کام کرنے والوں کو زندہ رہنے کے لئے تھوڑے تھوڑے پیسے دیئے جاتے تھے۔ اس سے زیادہ ممکن بھی نہیں تھا۔ لیکن مایا کو ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ سارے شہر میں مشہور ہوگئی اور لوگ اسے ڈھونڈ کر آنے لگے اور اس کی زندگی پہلے کی نسبت زیادہ آرام اور اطمینان سے کٹنے لگی۔ مگر اس کی روح کی تڑپ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دل ایک چھوٹے سے گھر اور اطمینان کی زندگی کے لئے بے چین رہتا تھا۔ جیسی زندگی اس نے گاؤں کے لوگوں کی دیکھی تھی۔ مگر وہ زندگی اس سے بہت دور تھی۔ ہر روز اس کے گھر پر محبت کرنے والے آیا کرتے تھے۔ مگر محبت اس سے بہت دور تھی۔

اچانک ایک رات جیسے گھنگھور بادل سے چاند نکل آئے، اس کے گھر موہن آگیا۔ بڑی لمبی موٹر کار میں بیٹھ کر اور بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے اور آتے ہی بولا۔

"ارے تم یہاں کیچڑ میں کنول؟"

اور مایا اس کو تکنے لگی تھی۔ اب تک نہ جانے کتنے اس گھر میں آئے تھے اور نہ جانے کیسی کیسی باتیں کر گئے تھے۔ لیکن کسی نے اسے کیچڑ میں کنول نہیں کہا تھا۔ موہن نے دوسروں کی طرح اس سے کاروباری باتیں بھی نہیں کیں۔ بلکہ جتنی دیر رہا ان ڈراموں کی تعریف کرتا رہا جن میں اس نے حصہ لیا تھا اور چاروں طرف دیکھ کر منہ بناتے ہوئے بولا۔

"کیا کروگی مایا دیوی؟ یہ ہمارا دیش ہے اور یہاں کلاکاروں کی عزت" اور مایا کو معلوم ہوا تھا کہ موہن نے اس کے دل کی بات کہہ دی اور مایا نے محسوس کیا تھا کہ موہن جو کچھ بول رہا ہے وہ آواز کہیں دور سے آرہی ہے۔ اور کچھ دیر کے بعد ہی موہن نے آہستہ سے سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا اور چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ اسی رات مایا نے زندگی میں پہلی بار سو روپے

اپنے ہاتھ میں دیکھے تھے۔ اور موہن کے چلے جانے کے بعد وہ کچھ نہیں سمجھ سکی تھی کہ آخر موہن کیوں آیا تھا اور کیا چاہتا ہے۔ اور بہت سوچنے پر بس اس نتیجے پر پہنچ سکی تھی کہ موہن نے شراب پی رکھی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ مگر نشے میں ہونے کی کوئی بات اس نے نہیں کی تھی۔ وہ بالکل ہوش میں تھا اور اس نے جو بھی باتیں کی تھیں، ہوش کی تھیں۔ اس رات وہ کچھ بھی نہیں کر سکی۔ سویرے ہی دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹ رہی اور اس خیال سے کھیلتی رہی کہ موہن اگلی رات پھر ضرور آئے گا۔ اس کے دل میں موہن کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ یہ نوجوان آخر پیتا کیوں ہے؟

دوسری رات موہن پھر آیا۔ اس رات اس نے کچھ زیادہ پی رکھی تھی۔ اور اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ آتے ہی اس نے کہا۔

"مایا! میں چاہتا ہوں کہ تم میری ہو جاؤ۔"

اور وہ اس کا منہ تکنے لگی تھی اور موہن نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم میری ہو جاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بیاہ کر لو۔"

اور اس کا دل اچھلنے لگا تھا کہ کیا وہ نشہ میں بول رہا ہے یا ہوش میں۔ اور موہن نے اس کے دل کا حال پڑھ لیا تھا اور بولا تھا۔

"مایا! میں نشے میں نہیں ہوں۔ ہر بات سوچنے اور سمجھنے کے بعد کر رہا ہوں جواب چاہتا ہوں؟"

مایا نے کہا تھا۔

"ایک شرط پر۔"

اور موہن نے جیسے اچھل کر کہا تھا۔ "ہر شرط منظور۔ تم کو اپنا بنانے کے لئے ہر شرط منظور کر سکتا ہوں۔"

اور اس نے کہا تھا۔

"پینا چھوڑ دو۔"

اور موہن نے کہا تھا۔

"یہ بھی منظور ہے" اور وہ اس کا منہ تکنے لگی تھی اور موہن نے اس سے کہا تھا۔
"تم میری بن جاؤ گی تو مجھے دنیا میں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی"۔

اور موہن نے اسی وقت ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ مگر وہ اس وقت اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ اسے بہتوں کا قرض ادا کرنا تھا۔ موہن نے اسی وقت دو ہزار نکال کر دیئے تھے کہ قرض ادا کر دے اور دوسرے دن سے ہی دوسری زندگی گزارنے پر تیار ہو جائے۔ اور دوسرے دن سے اس کی نئی زندگی شروع ہو گئی تھی۔ جس میں چھ مہینے تک جوار بھاٹا اور چڑھاؤ اتار آ رہا تھا۔ اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلے جو اس نے خواب دیکھا تھا وہ کبھی پورا نہیں ہو گا اور اس کی زندگی الجھ کر رہ جائے گی۔ موہن کے باپ نے اس کو بہو بنا کر گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا تھا اور موہن نے اس کے بغیر گھر میں رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی اپنی کوئی آمدنی بھی نہیں تھی۔ ساری دولت باپ کی تھی۔ اور باپ ایسی بہو کو گھر میں لا کر برادری میں ناک کٹوانے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ موہن نے معمولی سی نوکری کر لی اور ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کو تیار تھا۔ اس بیچ کھیر میں بہتوں نے اس کو بہکایا اور لالچ دیا۔ لیکن وہ پہاڑ کی طرح اپنے ارادوں پر قائم رہی۔ کبھی اس کے پاؤں نہیں لڑکھڑائے۔ وہ جس گندگی سے نکل کر آئی تھی وہاں پر جانے کے لئے تیار نہیں تھی اور موہن کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی جو اس کے لئے آسمان سے گر کر سب سے نیچی سطح پر آ گیا تھا۔

اور صرف دو دن پہلے اس کی زندگی پھر بدل گئی تھی۔ موہن کے باپ نے تھک کر اسے اجازت دے دی تھی اور وہ اس عالیشان مکان میں دولت مند آدمی کی بہو بن کر آ گئی تھی۔ اور چاہے کسی کے دل میں کچھ ہو۔ مگر سب نے اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔ ساس اور نندوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو اسے بری لگے یا اس کا دل چھوٹا ہو اور اس نے بھی بتانے کی کوشش کی تھی کہ موہن کیچڑ سے کنول نکال لایا ہے اور موہن کی ماں جب آشرم جانے لگی تو ساتھ لیتی گئی۔ لیکن سوامی جی مہاراج نے ایسی بات کہہ دی کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔

ساری باتیں مایا کے دماغ میں آ گئیں۔ تصویروں کی طرح اور وہ رونے لگی۔ اور سوچنے لگی۔ آیا آدمی کے کئے ہوئے پاپ نہیں دھل سکتے۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر۔ پھر۔ کیا وہ زندگی

کو اس طرح بدل کر بھی بیسوا ہی ہے۔ کیا وہ جب تک زندہ رہے بیسوا ہی رہے گی؟
یکایک کمرے میں کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے دیکھنا چاہا لیکن نہ اٹھ سکی۔ یوں سمجھ گئی کہ اس کمرے میں موہن کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ وہ جلدی جلدی آنسو پینے لگی کہ اس کے کان میں آواز آئی۔

"تم آشرم نہیں گئیں۔ سوامی جی مہاراج کے درشن کو؟"

مایا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ موہن نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم رو رہی ہو کیا؟"

مایا نے اپنا سر موہن کے قدموں پر رکھ دیا اور بولی۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ سب سے بڑے سنیاسی اور مہاتما تم ہو۔ میرے سوامی۔ تم نے مجھے نرک سے نکال کر یہاں بٹھایا ہے۔ مجھے کسی دوسرے مہاتما کی ضرورت نہیں۔"

واجدہ تبسم

اے رُودِ مُوسیٰ!

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ——— ؟

سترہ سال کی عمر میں، میں خوبصورتی کا مکمل نمونہ تھی ——— میرا جسم متناسب تھا، قد لمبا لمبا، ہاتھ پاؤں صندلیں، آنکھیں شراب کے پیالے ——— رنگت ایسی جیسے کسی نے میدہ گلابی پانی سے گوندھ کر رکھ دیا ہو ——— تم اگر اسے خودستائی نہ کہو تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ میں نے دنیا میں خود سے زیادہ حسین شکل کوئی نہ دیکھی ——— اور میرے اس حُسن کا مول بھی بہت اُونچا تھا۔

میری منگنی شہر کے ایک بہت بڑے رئیس کے ولایت پلٹ لڑکے سے ہو چکی تھی اور اسی لئے بھائی میاں مجھے بڑی سرگرمی سے چھری کانٹے سے کھانا کھانا سکھا رہے تھے ——— کبھی کبھی میں کانٹا زبان میں چبھا لیتی ——— یا چھری اس بے دردی سے ڈبل روٹی پر چلاتی کہ میری اُنگلی کٹ جاتی ——— اور نتیجے میں بھائی جان میرے سر پر ایک آدھ دھول جڑ دیتے ——— انھوں نے ہزار بار بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ کانٹے میں اٹکے رُوٹی یا گوشت کے ٹکڑے کر، دانتوں کی مدد سے بڑی آہستگی سے زبان پر اُتار لینا چاہیئے، مگر میں اکثر کانٹا اس انداز سے مُنہ میں رکھتی کہ زبان میں چُبھ چُبھ جاتا ——— مگر کانٹے کی یہ چبھن بھی بھلی لگتی ——— یہ سب کچھ میں اپنی نئی زندگی میں داخل ہونے کے لئے ہی تو سیکھ رہی تھی نا ——— ؟؟

جب بھائی میاں مجھے کھانا کھانا سکھا رہے ہوتے، دالان میں امّاں بیٹھی خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورے جاتیں ——— جس گھرانے میں میری بات لگی ہوئی تھی، وہ گھرانا بڑا فارورڈ

تھا ـــــ وہاں کے سارے طور طریقے بالکل انگریزوں کے سے تھے، اماں ڈرتی تھیں کہ میں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اگر کوئی الٹ پلٹ بات کر دی تو اتنا اچھا رشتہ ہاتھوں سے نکل جائے گا ـــــ ! ولایت پلٹ لڑکے بھلا کوئی روز روز ملتے ہیں جی ـــــ ؟ تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ـــــ ؟

میں سوچتی اماں کے خدشے بھی بے بنیاد تو نہیں ہیں ـــــ کانچ کے نازک اور خوبصورت کھلونے کو کوئی ٹھوکر مار دے تو کیا انجام ہوتا ہے ـــــ وطن میں ہماری زندگی بھی تو ایسی ہی نازک نازک، خوبصورت کانچ کے کھلونے ایسی تھی ـــــ وقت کی مضبوط ٹھوکر پڑی اور کھلونا چکنا چور تھا ـــــ پرانی زندگی کی یاد کو لے کر اب کرنا بھی کیا تھا ـــــ وہ ساری خوشیاں اور ولولے تو سرد پڑ گئے تھے ـــــ اب تو پیٹ کی آگ تھی اور کچھ نہیں ـــــ جسے کسی نہ کسی صورت بجھانا تھا ـــــ ابّا راستے میں بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے، اور لٹ پٹا کر ہمیں، اماں اور بھائی میاں کسی نہ کسی طرح بچ نکلے ـــــ ان دنوں میں کس قدر ذرا سی تھی ـــــ ؟ پھول کی طرح تازہ ـــــ کانچ کی طرح نازک، اماں مجھے اس طرح بچا بچا کر لائی تھیں جیسے مرغی چیل کو منڈلاتے دیکھ اپنے پروں میں اپنے بچے کو چھپا چھپا لیتی ہے ـــــ میں اماں کے پروں میں دبی، دھنسی، پتہ نہیں کن کن راستوں سے گزرتی جاتی تھی ـــــ راستے میں کبھی کبھار آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اُٹھا کر ریل کی کھڑکی سے باہر جھانکتی تو رات کا پُراسرار اندھیرا اور سنّاٹا جیسے میری روح سلب کیے لیتا ـــــ میں گھبرا کر پھر آنکھیں موندھ لیتی ـــــ !

زندگی کا پہلا سفر انہی اندھیروں میں کٹا ـــــ شاید اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو اُجالوں کی چاہ کرتے ہیں انہی کو اندھیرے ملتے ہیں ـــــ اپنے پیچھے ہم کیسی زندگی چھوڑ آئے تھے ـــــ ؟؟ بھرا پُرا گھر ـــــ ہنستا جھومتا وہ باغ ـــــ پورٹیکو میں ابھی ابھی آکر کھڑی ہوئی کار ـــــ وہ نیلے رنگ کے پردوں والا ڈائننگ روم ـــــ اور ـــــ اور ـــــ

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ـــــــ ؟؟

ہم آگے بڑھ آئے ، زندگی وہیں رہ گئی ـــــــ میں نے اپنی کتابیں، کاپیاں جو میز پر کھول کر رکھی تھیں، شاید ابھی تک کھلی پڑی ہو ـــــــ میز کے کنارے میں نے دوات کا ڈھکنا رکھ دیا تھا ـــــــ کون جانے وہ وہیں پڑا ہو ـــــــ الجبرا کا ایک سوال میں نے ابھی پورا حل بھی نہیں کیا تھا ـــــــ سنہری روشنی میں اپنی میز پر جھکی جھکی میں کس قدر لگن اور اشتیاق سے ادھورا سوال حل کر رہی تھی ـــــــ ؟؟ پھر میں وہ سوال کبھی حل نہ کر سکی ، وہ سنہری روشنی وہیں کھو گئی ـــــــ شاید دوات لڑھک گئی تھی، تبھی تو سارے میں سیاہی پھیل گئی تھی ـــــــ رات کی طرح تاریک اور ڈراؤنی ـــــــ پھر سب کچھ اس سیاہی ، اس تاریکی میں ڈوب گیا ـــــــ مٹ گیا ـــــــ فنا ہو گیا اور ہم دھیرے دھیرے چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے یوں نکل آئے کہ پیچھے پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکے ـــــــ میں تم سے پوچھتی ہوں اتنے دن گزرنے پر بھی یہ دکھ جی سے کیوں نہیں جاتا ـــــــ ماہ وسال کے کندھوں پر رکھا ہوا یہ بوجھ ہلکا کیوں نہیں ہوتا ـــــــ کیوں نہیں ہوتا ـــــــ ؟؟ بولو ـــــــ بولو نا ـــــــ مگر نہیں ـــــــ مجھے اس طرح جذباتی نہیں ہونا چاہیئے ـــــــ مجھے آج تم سے کوئی سوال نہیں کرنا ہے ـــــــ بس تمھیں سب کچھ سُنانا ہے ـــــــ جی کا یہ بوجھ کسی طرح تو ہلکا پڑے ـــــــ دل کا یہ دکھڑا کوئی تو سُنے ـــــــ میرے غم سے بھرے دل کو ایک ہلکی سی مسرت یہ تو مل جائے کہ کوئی تو تھا جس نے میرا غم بانٹا ـــــــ تمھارا یہ پُر سکون انداز ـــــــ تمھاری یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ واقعی تم غور سے میری باتیں سن رہے ہو ـــــــ نا ؟؟

میں اُلجھے ہوئے دھاگوں میں سرا تلاش کرتے کرتے بھٹک جاتی ہوں ـــــــ بھول جاتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی تھی ـــــــ اتنی ساری باتیں اک دم سے زبان کی نوک پر آکر مچلنے لگیں تو کیسے نہ کوئی راہ بھولے ؟ کیسے نہ میں سرا کھو دوں ـــــــ ؟

ہم نے اس دیارِ غیر میں قدم رکھا تو کوئی آسرا نہ تھا ——— کوئی سہارا نہ تھا ———
بھائی میاں اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنا چاہتے تھے، مگر کوئی ذریعہ، کوئی آسرا نہ تھا ———
وہ ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھتے تھے، مگر صرف ایف ایس سی پر آکر ان کی گاڑی رُک گئی ———
میں نے زندگی کے جو سہانے خواب بنے تھے سب جہاں کے تہاں رہ گئے ——— بھائی میاں
جوتیاں چٹخارتے سارے شہر کی خاک چھانا کرتے کہ کہیں سے چار پیسے کا آسرا مل جائے اور اِدھر
میں اور اماں ایک تنگ تاریک سے مکان میں ——— (ایسا مکان، جسے مکان کہنے کو بھی جی
نہیں چاہتا) زندگی کی دھوپ چھاؤں کے رنگ دیکھا کرتیں ——— کیا تم سمجھتے ہو ویرانے
میں کھلنے والی کلی کبھی پھول نہیں بنتی ——— ؟؟ میں اسی ویرانے میں کلی سے پھول
بننے لگی ——— اور سچ جانو ایک دن اسی اندھیارے کمرے کی دیواروں نے پہلی بار
چاند کی کرنوں کا سامنا کیا ——— !!

بھائی میاں کو چالیس روپئے ماہانہ کی بہت بڑھیا سی ملازمت مل چکی تھی، جہاں وہ دن بھر مغز پاشی
کرتے اور شام کو یوں لوٹتے جیسے ابھی ابھی مر جائیں گے ——— کاش مر ہی جاتے ———
زمین کی چھاتی پر کا بوجھ کچھ تو کم ہوتا ——— ! مگر یہ سُنو کہ ہم میں سے کبھی کوئی نہ مرا ——— دُنیا
میں غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی کوئی راہ نہیں ——— کوئی
کیا جیئے کیا مرے ——— ؟

معاف کرنا۔ تم پتہ نہیں ہمارے متعلق کیا سوچو، مگر یہ بات میں سنائے بغیر نہیں رہوں گی
کہ ان حالات کے باوجود میرا اس قدر اعلیٰ گھرانے میں رشتہ طے پاجانا، کس وجہ سے تھا ———
وہ محض ایک سوٹ تھا ——— ہاں ہاں اونی سوٹ ——— گرے کلر کا ———
بھلے ہی تم اسے بُرا کہہ لو، مگر میں نہیں کہوں گی ——— اگر آدمی کو کھانے کو نہ ملے، پہننے کو
نہ ملے تو میں سمجھتی ہوں اُسے ہر عیب کو ہُنر سمجھنا چاہیئے ——— بھائی میاں کئی دنوں سے
ایک جوڑے پر گزارہ کر رہے تھے ——— چالیس روپئے میں کیا ہو سکتا ہے؟ شاید یہ بات
تمھاری سمجھ میں نہ آسکے، مگر ہم دیکھ سکتے ہیں نا ——— اس دن چکنی، کالی لمبی سڑک پر،

جبکہ کوئی موٹر، سائیکل، بس نہ تھی، اکیلے بھائی میاں چلتے چلے آرہے تھے اور ان کے آگے آگے ایک خوش پوش جوان ——— (اوہ ذرا سوچو، غریبی کسقدر بڑی معلم ہے ———) بھائی میاں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور پیچھے سے اس خوش پوش کی گردن پر ایک دھول جمائی ——— بھائی میاں ایسے کوئی ظالم تو نہ تھے کہ اسے جان سے مارنے کے بارے میں سوچتے ——— وہ تو محض اپنی ضرورت پوری کرنا چاہتے تھے ——— تھوڑی دیر بعد جب بھائی میاں اسی تمکنت اور بھرم سے سڑک پر چل رہے تھے تو ان کے جسم پر وہ قیمتی گرے کلر کا سوٹ تھا اور اس خوش پوش نوجوان کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے ———

ہاں تب میں نے جانا کہ لباس قسمتیں بدل دیا کرتا ہے ——— بدل سکتا ہے ———

دیکھو ہم لوگ غریب ضرور ہیں، مگر اپنا عیب نہیں چھپاتے ——— سچائی میں جیت ہے نا ——— بس اسی لئے ——— رات کو بھائی میاں نے بڑے فخر سے بتایا کہ کس طرح وہ پلک جھپکتے میں ایک قیمتی سوٹ کے مالک بن بیٹھے تھے ——— اس رات ہم دونوں کتنی دیر تک ہنستے رہے ——— اُف! مت پوچھو ——— کیسی خوشی تھی کہ بس ہنسی رکتی نہ تھی ———!

دوسرے دن وہی سوٹ پہن کر بھائی میاں اپنی سروس پر گئے تھے ——— اور پھر پتہ ہے کیا ہوا تھا ——— ؟؟ اسے اتفاق بھی کہہ سکتے ہیں ——— قسمت بھی کہہ سکتے ہیں ——— بہر حال ہوا یوں کہ جب بھائی میاں اپنی میز پر جھکے قلم چلا رہے تھے تو ان کا باس ان کے پاس آکھڑا ہوا ——— پہلے تو وہ سر سے پاؤں تک ان کو دیکھتا رہا، ——— دیکھتا رہا ——— پھر یوں گھوم پھر کر ان کے گرد پھیرے ڈالے جیسے کوئی قربانی کے لئے بکرا خریدنا چاہتا ہو ——— دیکھ لینا چاہتا ہو کہ کوئی کمی تو نہیں ہے ——— کن کٹا تو نہیں ہے ——— لنگڑا تو نہیں ہے ——— بیمار تو نہیں ہے ——— بھائی میاں نے سر اٹھا کر دیکھا اور گھبرا کر سر جھکا لیا ———

"آجکل تو یہ کپڑا ملتا ہی نہیں ——— کہاں سے خریدا ہے مسٹر ———" وہ بہت سادگی سے پوچھ رہا تھا ———

"جی ــــ جی ــــ جی ــــ" بھائی میاں ہکلا گئے اور بولے ــــ "اگر آپ کو یونہی بھلا لگتا ہے تو لے لیجیے نا ــــ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی میری ــــ" یا بس مسکرا کر رہ گیا ــــ

گھر آکر پوری رُوداد بھائی میاں نے مجھے بتائی اور یہ بھی کہا کہ اس اہم فرض کو میں ہی انجام دوں ــــ کہ ان کے پاس تک یہ سوٹ پہنچادوں ۔ (اس لمحہ ان کے چہرے پر چراغ سا جل رہا تھا ــــ اُمّید کا ہی ہوگا ــــ!)

پہلے تو بڑی دیر تک حیل حجّت ہوتی رہی کہ میرا جانا مناسب ہوگا بھی یا نہیں ــــ اور جب یہ طے ہوگیا تو یہ مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ میں اتنے بڑے بنگلے پر جاؤں گی تو سہی، مگر پہنوں گی کیا ــــ؟

تم یوں لمبے لمبے سانس کیوں لے رہے ہو ــــ؟ ترل ــــ ترل ــــ ترل ــــ شاید سوچ رہے ہو کہ آگے میں کیا کہوں گی ــــ ہاں شاید تم یقین نہ کرو کہ زندگی کیا تھی ــــ کیسی تھی ــــ کس کم بخت کے پاس خوشی تھی ــــ؟؟ آنسو ہی تو تھے جو ہر موقع پر برس برس کر اندھیروں میں اُجالے پیدا کرتے تھے ــــ خیر ــــ اس اکلوتی سفید ساڑھی کو جو امّاں نے پتہ نہیں کس خیال سے سینت کر رکھی تھی ، میں نے اپنے جسم کے گرد لپیٹا ــــ اور تم ایک شئے کو سوچو کہ اس سفید لباس میں مَیں کیا قیامت ڈھا رہی ہوں گی ــــ؟؟ یہ گال اس وقت مرجھا کر زرد پڑ گئے ہیں تو کیا ہوا ــــ؟ یہ لمبے لمبے بال اب دھول سے اٹ گئے ہیں تو کیا ہوا ــــ یہ صندلیں بازو اور کھلتا ہوا جسم نڈھال ہوگیا ہے تو کیا ہوا ــــ تب تو میں ایسی نہ تھی ــــ میں تو شبنم میں نہایا ہوا تازہ تازہ پھول تھی جس کی پنکھڑی پنکھڑی سے رس نتھرتا تھا ــــ حُسن اپنی قیمت ــــ اپنی بولی اُٹھوانے چلا تھا ــــ!

بھائی میاں نے پھاٹک کو ذرا سا دھکّا دیا اور ایک بڑے بڑے بالوں والے پیلے رنگ کے کُتّے نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا ــــ بھائی میاں تو مصلحتاً باہر جا کر چُھپ گئے اور مَیں وہیں کاغذ میں بندھا سوٹ سنبھالے سہمی سی کھڑی رہ گئی ــــ

کتے کی آواز سُن کر پہلے تو چپراسی اور پھر ایک خوبصورت سا جوان آدمی باہر نکل آیا ——

اب میں تم سے یہ نہ بتاؤں گی کہ کتنے لمحے یونہی گزر گئے تھے —— نہیں، ایک بھی لمحہ نہیں گزرا تھا —— نہیں نہیں —— شاید میں بھول گئی ہوں —— مجھے تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ساری عمر گزر گئی تھی —— ایک صدی سے کم کیا گزری ہو گی —— نہیں شاید وقت ٹھٹھک کر یونہی ساکت ہو گیا تھا —— وقت تو مگر کبھی نہیں رُکتا نا —— ؟ تو شاید میں ہی بھول رہی ہوں —— !

پھر میں ایک بہت سجے سجائے ڈرائینگ روم میں تھی —— ہمارے دِلّی والے ڈرائینگ روم سے بھی بڑھ چڑھ کر سجا سجایا —— ! تم کیا سمجھتے ہو مَیں اپنا ماضی بھول گئی ہوں —— بھول سکتی ہوں —— ؟ ارے توبہ کرو —— ! عورت کے چار آنکھیں ہوتی ہیں —— دو چہرے پر —— دو پیٹھ پر —— چہرے پر کی آنکھیں تو سبھوں کو نظر آتی ہیں، مگر وہ جو پیٹھ پر ہوتی ہیں نا وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا —— صرف عورت انھیں محسوس کرتی اور ان سے ماضی کو دیکھتی رہتی ہے —— یو جیتی رہتی ہے —— مرد کی نگاہ مستقبل پر ہوتی ہے اور عورت ماضی کو دیکھتی، پلٹ پلٹ کر، مُڑ مُڑ کر، بڑھتی ہے —— مَیں کیسے اپنا ماضی بھول جاتی —— بچّہ تھی تو کیا ہوا —— عورت تو تھی —— !

میں سہمے ہوئے پرندے کی طرح صوفے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور وہ بچوں کی طرح مجھ سے برتاؤ کر رہے تھے —— یہ لو —— وہ لو —— یہ کھاؤ —— وہ چکھو —— !

استنے میں دروازے کا پردہ ہٹا اور بھائی میاں داخل ہوئے —— اپنے ازلی اور اکلوتے جوڑے میں ملبوس —— میں نے ذرا طنز سے پاس کی طرف دیکھا —— "دیکھ لی ہماری حقیقت —— " میری نگاہیں یہی کچھ کہہ رہی ہوں گی اس کا مجھے یقین ہے —— کیونکہ اسی لمحہ میری نگاہوں کو پڑھ کر انھوں نے

فوراً بھائی میاں سے کہا تھا ———

"جمیل صاحب ——— بات بے ڈھب اور اچانک ہی کہہ رہا ہوں ——— مگر کیا آپ اپنی بہن کو میری دلہن بنانا پسند کریں گے ——— !"

وہ باس تھے اور بھائی میاں ان کے ماتحت ——— شاید کوئی اور موقعہ ہوتا، کوئی دوسرا مخاطب ہوتا تو ان کے لہجے میں اتنی بے تکلفی اور انداز گفتگو اتنا صاف صاف نہ ہوتا ——— مگر بھائی میاں تو پاتال میں تھے ———

بھائی میاں اس قدر سراسیمہ، اس قدر حیرت زدہ، اس قدر پریشان سے رہ گئے کہ منہ سے کچھ نکلا ہی نہیں ——— ! بڑی دیر بعد وہ بولنے پر آئے تو پھر بولتے ہی چلے گئے اور ہماری زندگی کی کوئی بات ایسی نہ تھی جو انھوں نے نہ سنا دی ہو ——— !

"میں جانتا ہوں ——— میں جانتا ہوں ———" وہ سگار کو میز پر ٹھپک ٹھپک کر اتنا ہی کہے جا رہے تھے ———

"آپ جانتے ہیں نا ہم کتنے غریب ہیں ——— آپ کو معلوم ہوگا نا کہ میری بہن صرف ساتویں کلاس پاس ہے ——— آپ تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے پاس رہنے کو ڈھنگ کا مکان بھی نہیں ——— پہننے کو کپڑے بھی نہیں ——— سونے کو بستر بھی نہیں ——— اور......

"اور" ——— انھوں نے بات کاٹ دی ——— "اور آپ جانتے ہیں کہ میں ایک نواب کا بیٹا ہوں ——— اور اپنا ایک ذاتی بزنس چلائے ہوں، اتنی بڑی دولت کا مالک ہوں ——— اتنے بڑے بنگلے میں تنہا رہتا ہوں تنہا حقدار ہوں ——— اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں محض سیر کے طور پر ہزاروں روپے خرچ کر کے لندن ہو آیا ہوں ——— اور اب آپ یہ بھی جان رہے ہیں کہ میں آپ سے آپ کی بہن کا ہاتھ مانگ رہا ہوں ——— اور یہ بھی سُنا دوں میں پاگل نہیں ہوں ——— آپ سے مذاق بھی نہیں کر رہا ہوں ——— آپ کو دھوکا بھی نہیں دے رہا ہوں ———

آپ کی بہن سے باقاعدہ شادی کروں گا ــــــ" وہ رُکے ــــــ آگے بڑھے ــــــ
میرے قریب آکر ٹھٹھک گئے اور میرا چہرہ اُوپر اُٹھا کر بولے ــــــ
"یہ انسان نہیں ــــ پری ہے ــــــ اور میں بہت حسن پرست واقع ہوا ہوں
جمیل ــــ!" اور وہ اُمید بھری نگاہوں سے بھائی میاں کو دیکھنے لگے ــــــ
تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ــــــ؟؟
ایک انسان، خدا بن کر ہماری زندگی میں آیا اور ہم پر آسمان بن کر چھا گیا ــــــ
زندگی کس قدر حسین تھی ــــ! کتنی خوشگوار ــــــ کتنی پیاری ــــــ
مگر ــــ مگر کیا انجام بھی اتنا ہی حسین، اتنا ہی خوشگوار، اتنا ہی پیارا ہو سکتا
تھا ــــــ؟
تم بے چین ہو رہے ہو ــــــ ہاں تمھاری ساکن سطح پر یہ کیسی ہلچل ہے ــــــ
کیا میری باتوں سے تمھارے دل میں بھی دکھ کی لہریں پیدا ہو رہی ہیں ــــــ؟؟
اے رُودِ موسیٰ ــــــ ٹھہر جا ــــــ تھم جا ــــــ میری باتیں سُن لے
ــــــ میرے دل کا درد، اپنے دل میں بھر لے ــــــ میں اس درد کو اپنے ساتھ
نہیں لے جانا چاہتی ــــــ نہیں لے جانا چاہتی ــــــ آج اپنی زندگی کی خوشیوں اور
مسرتوں کا حساب لے کر میں تیرے پاس آئی ہوں ــــــ سن لے میری داستان
ــــــ سن لے ــــ سُن لے ــــــ
زندگی پر چھائے غم کے گہرے بادل جیسے ایک دم چھٹ کر رہ گئے ــــــ زندگی میں
سکون اور مسرت آ گئی ــــــ یہ ایسی خوشی تھی جس کے بارے میں سوچا بھی نہ جا سکتا تھا ــــــ
اماں میرے لیے کتنی پریشان رہا کرتی تھیں ــــــ غریبی اور حُسن جہاں ایک جگہ ہو جائیں
وہاں آپ ہی آپ ایک چکلہ کھل جاتا ہے ــــــ جوانی بہاریں لٹاتی آتی ہے اور پھر کسی
سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ــــــ اب نافہ مشک کی طرح میری خوشبو گھر سے باہر
نکل کر پھیل رہی تھی ــــــ زندگی جس راہ پر جا رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور

سوچا بھی کیا جا سکتا تھا ——— ؟ مگر بالکل اس طرح، جیسے کالی رات میں اچانک بجلی چمک جائے ——— اسی انداز سے ضیا میری زندگی میں داخل ہو گیا ———

بھائی میاں مجھے سر پر ڈھول دھپے جڑ جڑ کر چھری کانٹے سے کھانا کھانا سکھانے لگے اور اماں مجھے رہ رہ کر گھورنے لگیں کہ میں یہ رشتہ کھو نہ بیٹھوں ——— !!

اے موسیٰ کے گہرے پانیو ——— اے بے تاب لہرو ——— ذرا میرے دل میں آ کر جھانکو ——— اے موسیٰ تیری زندگی تو اسی حیدرآباد میں گزری ہے، یہاں کے چپے چپے سے تیری شناسائی ہو گی ——— یہاں کی زندگی کا ہر ہر راز تیرے سینے میں دفن ہو گا ——— مجھے یہ تو بتا کیا یہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ، بیٹوں کے دلوں کا خون کر دیں ———! دولت کے بل پر اپنی بوڑھی رگوں کے لئے تازہ خون خرید لیں ——— کیا یہاں پیسہ ہی سب کچھ ہے ——— کیا نیکی، سچائی اور پیار کا کوئی مول نہیں ——— کوئی قیمت نہیں ——— ؟؟ میں ان اتھل پتھل لہروں سے جواب مانگتی ہوں ——— بولو ——— بولو ——— مگر نہیں ——— مجھے آج کوئی سوال کرنا نہیں ہے ——— مجھے تو آج صرف اپنی داستان سنانی ہے ——— یہ دکھ، یہ کرب، یہ غم میں اپنے سینے میں نہیں لے جانا چاہتی ——— میں پھول کی طرح ہلکی ہو جانا چاہتی ہوں ———

اُس دن میں اور بھائی میاں ضیا صاحب کے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے ہوئے تھے ——— وہ خود کہیں باہر گئے ہوئے تھے ——— بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور میں نے سردی سے بچنے کو اپنی ساڑی کا آنچل اپنے کانوں اور سر کے گرد لپیٹ لیا تھا ——— بیٹھے بیٹھے بھائی میاں نے مجھے دیکھا اور یونہی ہنس کر کہا ———

"مہر ——— خدا کی قسم تو خطرناک حد تک حسین ہے ——— کوئی حیرت کی بات نہیں جو ضیا صاحب نے تجھے مانگ لیا ——— مجھے تو فرشتوں کے بارے میں بھی شک کرنا پڑیگا ———!"

میں نے ذرا جھینپ کر سر جھکا لیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے پھر سے سر اُٹھانا پڑا ——— کیونکہ دھڑ سے دروازہ کھلا اور ......

ہم دونوں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ـــــ وہ ضیا صاحب نہیں تھے کوئی اور تھا ـــــ آنے والے کی نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں ـــــ اور خود میں بھی گھبرا کر بھائی میاں کو دیکھنے تھی کبھی آنے والے کو ـــــ

"آپ کی تعریف ـــــ ؟" آخر آنے والے نے بھائی میاں سے مخاطب ہو کر زبان کھولی ـــــ

"جی میں جمیل ہوں ـــــ ضیا صاحب میرے بوس ہیں ـــــ اور یہ ......

یہ میری بہن ـــــ مہر ـــــ"

"سچ مچ مہر ـــــ ؟" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پھر بولا ـــــ "اور میں ضیا کا والد ہوں ـــــ نواب آصف الدولہ ـــــ نام تو سنا ہو گا میرا ـــــ ؟"

وہ مسکرا کر میری طرف گھوما ـــــ "حیدرآباد میں جتنی کوٹھیاں میری ہیں، اتنی شاید ہی کسی نے بنوائی ہوں ـــــ اور پھر کوٹھیوں کی کیا بات ہے ـــــ بزنس وغیرہ بھی چلتے ہی رہتے ہیں ـــــ اور ضیا میاں کو جو کام میں نے سونپا ہے وہ بھی بس ......" وہ خود ہی مسکرا کر رک گیا ـــــ مگر ہم دونوں میں سے کوئی نہ مسکرا سکا ـــــ پہلی ہی ملاقات میں، آتے ہی ایسی بے سر پیر کی ہانکنا ـــــ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا ـــــ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہو بھی سکتا ہے ـــــ اتنے عجیب انداز میں تو کوئی اپنے متعلق نہیں بتاتا ـــــ اور حد یہ کہ کسی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا تھا ـــــ ! وہ پھر کہے گیا

"جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہوں تو بس یوں ہی اُٹ جُھٹ کر چلا آتا ہوں ـــــ نوکروں اور مصاحبوں کے جمگھٹے میں باہر نکلنا مجھے مطلق پسند نہیں ـــــ کار بھی خود ہی ڈرائیو کرتا آیا ہوں ـــــ پورے ساٹھ ہزار کی ہے ـــــ"

یقیناً یہ شخص پاگل ہے ـــــ میں نے دل ہی دل میں سوچا ـــــ مگر اسے دیکھ کر اس قدر سہم گئی تھی کہ کچھ نہ کہہ سکی ـــــ !

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ــــــــ ؟ ذرا دل لگاکر سنو خدا کی بنائی یہ دنیا کیسی ہے ــــــ یہاں بسنے والے کیسے ہیں ــــــ تو تم جاننا چاہو گے نا کہ پھر آخر کیا ہوا ــــــ ! تو سنو اس بڈھے نے مجھے بھائی میاں سے مانگ لیا ــــــ !

ترل ــــ ترل ــــ ترل ــــــ یہ تمھارے سینے میں بے چینی کیسی ؟ شاید تمھیں حیرت ہو رہی ہے ــــــ مگر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے میرے شفیق اور مہربان دوست ــــــ یہ تو دنیا ہے، یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے ــــــ اور جب بھائی میاں نے انکار کیا تو وہ سانپ پھن پھنا اٹھا ــــــ اس کے حرم میں شاید مجھ ایسی بے بس روح کی ہی کمی تھی جو وہ مجھ پر ہر حربہ آزمانے تل گیا تھا ــــــ اور پھر انسان نے انسان کے ساتھ، شیطان کی سی چال چلی ــــــ

روپیہ ــــــ روپیہ ــــــ روپیہ ــــــ اس دنیا میں روپیہ کیا نہیں کر سکتا ؟ ؟ ــــــ کیا نہیں کر سکتا ــــــ محبت کی بولی لگوا سکتا ہے ــــــ پیار کا نیلام کروا سکتا ہے ــــــ بہن کی محبت کو بکوا سکتا ہے ــــــ تم جانو دس ہزار روپے معمولی چیز تو ہوتے نہیں ــــــ بھائی میاں نے مجھے بہکانا شروع کیا ــــــ "ضیا ــــ تو یہ سوچ زندگی بھر روپوں پر چلے گی ــــــ ضیا جو اتنا امیر ہے تو نواب صاحب کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا ــــــ نواب صاحب آسمان ہیں وہ پاتال ہے ــــــ تُو تو ملکہ بن کر راج رچے گی ــــــ ہاں دیکھ انکار نہ کرنا ــــــ"

میں کبھی غصّہ کو چھپا کر ان کی طرف دیکھتی تو وہ میری سُرخ رنگت کو شرم پر محمول کرتے کیسی بے بسی تھی ؟ ــــــ ذرا سوچو نا ــــــ

میں یہاں بھائی میاں کو بھی الزام نہیں دوں گی ــــــ کیوں دوں ؟ زندگی سے خوشیاں سمیٹنے کا حق ہر انسان کو ملنا چاہیے ــــــ نہیں ملتا تو پھر وہ ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے ــــــ بھائی میاں نے اب تک کیسی زندگی گزاری تھی ــــــ ؟ ضیا ــ صرف مجھے لگا تھا ــــــ میرے دکھوں کو سمیٹ کر اپنے دل میں چھپانا چاہا تھا۔

—— بھائی میاں کے سکھوں کے لئے اُس نے کیا قیمت ادا کی —— کچھ بھی تو نہیں
اگر انھیں یہاں کوئی فائدہ نظر آیا تو کیا بُرا کیا جو انھوں نے میری زندگی کی بولی اٹھادی ——؟؟
یہ دنیا ہے میرے بوڑھے دوست —— یہاں ایسا ہی ہونا چاہیئے —— !

بھائی میاں کے جسم پر اب بہترین کپڑے تھے، رہنے کو خوبصورت سا گھر —— اور زندگی کی ہر آسائش مہیا تھی —— ایک دن نواب صاحب نے ہمیں خاص الخاص اپنے دولت کدے پر بلوایا تھا —— ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جب ہم آگے بڑھے تو ایک لمحے کو میں چکرا گئی —— کیا اس قید خانے' (وہ خوب صورت ہی سہی) میں مجھے رہنا ہوگا —— ؟؟ میں نے گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا —— میرے خدا —— یہاں لوگ کیسے رہ سکتے ہوں گے —— ؟ اتنی اونچی اور ہیبت ناک دیواریں ؟ کس میں بوتا تھا کہ ان کو پھلانگنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ——

نرم اور گہرے صوفے میں ایک بیگم بیٹھی ہوئی تھیں —— بڑی رعونت سے دیکھتی ہوئی —— بھائی میاں نے آگے بڑھ کر تعارف کروایا۔

"ان سے ملو مہر —— یہ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں —— اور یہ میری بہن ہے مہرو ——"

میرا خون جوش کھا گیا —— یہ میرا سگا بھائی تھا —— میرا ماں جایا، جو نواب صاحب کی بیگم سے میرا تعارف کروا رہا تھا —— میں نے بھوں بھوں کر کے اس کی طرف دیکھا —— مجھے اس کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آئے، میں نے خود کو مطمئن کر لیا —— ہاں ہاں ٹھیک ہے —— ٹھیک ہی تو ہے —— ایسا ہی ہونا چاہئے —— اس کے آگے انسان اور سوچ بھی کیا سکتا ہے —— ؟؟

(تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا —— ؟)

پتہ نہیں کن کن موضوعات پر گفت گو ہوتی رہی —— پھر پردہ اٹھا اور ایک بانکی طرحدار لڑکی کمرے میں داخل ہوئی —— پتہ چلا وہ نواب صاحب کی بیٹی تھی (جو عمر میں مجھ سے

بھی بُری تھی!) اس نے لڑکوں کی طرح پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی، سر کے بال پوڈل کٹ (POODIL CAT) کی شکل میں تھے ——— وہ مزے میں سگریٹ پھونکے جا رہی تھی اور دھوئیں کے مارے میرا دم گھٹ رہا تھا ——— یوں تو ہم عورتوں کی زندگی دھوئیں میں ہی گزرتی ہے مگر تم جانو یہ دھواں تو دم گھونٹ دینے کو تلا ہوا تھا ——— اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور وہ لڑکی اچھلی ——— اپنے ہونٹوں کا سگریٹ نکال کر اُس نے جھٹ اپنی ماں کے منہ میں دے دیا ———

”ممّا ——— تم ذرا سے اسموک کرو ——— میں ابھی آتا ہوں ——— “ ممّا خوشی خوشی سے اسموک کرنے لگیں ———!

میں نے لرز کر دیکھا ——— یہ کیسی تہذیب تھی؟ یہ کیسی زندگی تھی ——— ؟ کیا میں اس ماحول میں جی سکتی تھی ———؟؟ میرا سانس رک رک کر چلنے لگا ——— بھائی میاں لہک لہک کر، ہنس ہنس کر، سبھوں سے باتیں کئے جا رہے تھے ——— میں وہاں تھی مگر نہیں تھی ——— مجھے ہوش آیا تو وہ لڑکا نما لڑکی کہہ رہی تھی ——— ” ہلو پپّا اسیا اسٹیچو ہم لوگان میوزیم میں دیکھے تھے نا ——— ؟ اس کا اشارہ میری طرف تھا ———!

بھائی میاں نے اپنی بہن کے حسن کی تعریف کو بڑی خوش دلی اور فخر سے سُنا اور سینہ تان کر مجھے دیکھنے لگے ——— جیسے ” اس مال کا حقدار تو میں ہی ہوں ——— “

جب ہم باہر نکلے تو میرے قدم اس قدر وزنی ہو رہے تھے کہ مجھ سے چلتے نہ بن رہا تھا ——— دل و دماغ میں اس قدر کشمکش ہو رہی تھی ——— کیا کروں کیا نہ کروں ———؟

اکدم مجھے نواب صاحب کے مکروہ چہرے اور بڑے بڑے دانتوں کا خیال آ گیا اور میں نے طے کر لیا کہ نہیں میں اپنے آپ کو کبھی نہیں بیچوں گی ——— کبھی نہیں ——— کبھی نہیں ——— اس سے موت کیا بُری ہے ———؟

میں نے بڑی ہمت کر کے، شرماتے شرماتے، آہستگی سے بھائی میاں سے پوچھا ———

” نواب صاحب کو معلوم نہیں کہ میری شادی ضیا صاحب سے ہونے والی ہے ———؟؟“

"معلوم کیسے نہیں ہے ـــــ میں نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا مگر...... وہ بات ادھوری چھوڑ یونہی رُک گئے ـــــ

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر اسی لمحہ مجھے کوٹ کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آ گئے، ـــــ میں نے سوچا ـــــ ٹھیک ہے ـــــ ٹھیک ہی تو ہے، اس کے آگے انسان کچھ نہیں سوچ سکتا ـــــ عقل چٹ ہو جاتی ہے ـــــ

(تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ـــــ ؟؟"

گھر پہنچکر بھائی میاں نے اماں سے میرے پیام کے بارے میں بات کی، اماں بھی راضی جیسی تھیں ـــــ بیٹیاں تو اپنے گھر میں پھلتی پھولتی ہی بھلی لگتی ہیں اور ایسی بیٹیاں تو کبھی کبھار ہی جنم لیتی ہیں جو ماں باپ کا گھر بھی بھرتی جائیں ـــــ ورنہ بیٹیاں تو سدا گھر ہی خالی کرتی گئی ہیں ـــــ

اماں کسی کام سے اُٹھ کر گئیں، تو میں نے اپنی ساری ہمت سمیٹی اور مُنہ سے آواز نکالی۔ ـــــ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ وہ بات نہ تھی جو میں کہنے چلی تھی ـــــ میں کچھ بھی بک گئی ـــــ پھر سے میں نے ہمت جمع کی اور سوچا ـــــ یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے ـــــ خاموشی سے کچھ نہ بنے گا ـــــ مجھے کہہ دینا ہی چاہئے ـــــ اور میں نے پھر سے خود کو راضی کیا ـــــ

"بھائی میاں ـــــ" میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی ـــــ ان سے نظر ملانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔

میں نے پھر تھوک نگلا اور بولی ـــــ "بھائی میاں ـــــ"

پھر کچھ اس طرح جیسے لبلبی دبا دینے پر پھٹ سے گولی نکل پڑے، میں بول گئی ـــــ "میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ـــــ"

میرے دل پر سے جیسے پہاڑ ہٹ گیا ـــــ بھائی میاں خلاف توقع یونہی بیٹھے رہے ـــــ شاید وہ مجھے سوجھ بوجھ کی مہلت دے رہے تھے ـــــ بڑی دیر بعد بولے ـــــ

"پھر تم ابھی بچی ہو ——"

میں نے تیزی سے کہا —— "بچی ہوتی تو یوں میرا سودا نہ ہوتا ——"

اب کے انھوں نے چونک کر دیکھا اور خود بھی تیزی سے بولے ——

"بہت سمجھدار ہوگئی ہو ——!!"

"جب بڑے ناسمجھ ہو جائیں تو چھوٹے خود بخود سمجھدار ہو جاتے ہیں"—— میں نے جل کر کہا ——

"بک بک مت کرو ——" وہ گرجے ——

میں نے ان کی طرف دیکھا ——

"بک بک تو آپ کر رہے ہیں —— میں تو ہمیشہ سے ہی خاموش طبیعت ہوں ——"

وہ تیزی سے اٹھے، مگر جانے کیا سوچ کر رک گئے —— بولے ——

"خیر آج نہیں کل تو جانے والی ٹھہری، اس لئے خاموش ہوا جاتا ہوں، اور ابھی بک بک کا مطلب سمجھا دیتا ——"

میں نے اسی لہجے میں مضبوطی سے کہا —— "میں نے کہہ دیا میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی —— اس سے اچھا تو یہ ہے کہ انسان شیر کے ساتھ اس کے بھٹ میں جا رہے"

بھائی میاں میرے قریب آئے اور خونخوار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے ——

"نہیں کرے گی نواب صاحب سے شادی —— ؟ اور جو تیرے باپ کا گھر بھر دیا ہے نواب صاحب نے —— ؟ یہ عیش و آسائش اور کہاں سے مل سکتی ہے ناسمجھ کتیا —— بھول گئی کیا دو دو دن کے فاقے کرتی تھی، اندھیرے میں سوتی تھی، ننگی پھرتی تھی —— اب رہنے کو گھر مل گیا —— پہننے کو ریشم مل گیا اور پیٹ میں ترمال —— تو اینٹھتی ہے حرام زادی ——"

تم سن رہے ہو نا —— ؟ یہ میرا بھائی تھا —— سگا بھائی، جو مجھ سے یہ سب کچھ کہہ رہا تھا —— میں نے جھلا کر کہا ——

"مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے ——— مجھے اپنی وہی زندگی پسند ہے۔"

"ہے نا فقیرنی ——— اپنی اصلیت پر ہی جانے والی ——— مگر اب میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔"

میں اسی تیزی سے نہیں نہیں کہے گئی اور بھائی میاں نے پیر سے جوتا نکال لیا ——— ان کا دم اُلٹ گیا، میرا جسم نیلا پڑ گیا ——— اور میں بے سدھ ہو کر فرش پر گر پڑی۔

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں کرتی ———" جاتے جاتے وہ پھر سُنا گئے۔

پھر دھیرے دھیرے رات گذرنے لگی ——— میرے نصیبوں کی طرح سیاہ رات آنسوؤں کے ستارے لئے، دبے پاؤں میرے قریب سے گزرنے لگی ——— چوٹوں سے میرا جسم درد کر رہا تھا ——— زخم رس رہے تھے ——— اور جگر کے مارے سر نہ اٹھتا تھا۔

"بھاگ چل ——— خدا کی اتنی بڑی دنیا میں تیرا کوئی تو ٹھکانا ہوگا ——— یہی وقت ہے ——— دیر نہ کر ———"

میں نے یہ پکار سنی اور سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا ——— زیرو پاور کا بلب بڑی اُداس روشنی بکھیر رہا تھا ——— اماں کا کمرہ پرلے سرے پر تھا، بھائی میاں کے کمرے سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی اور ...... اور ....

میں نے دھیرے دھیرے خود کو سہارا دیا ——— اور کسی صورت کھڑی ہو گئی ——— جسم ٹوٹا جا رہا تھا ——— آنسو بہے جا رہے تھے اور سارا عالم ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا ——— پھر میں نے دھیرے دھیرے اپنے جسم کو پیروں کے سہارے آگے بڑھانا شروع کیا ——— الوداع میری پیاری ماں ——— الوداع ——— میں نے کمرے کی طرف دیکھا جہاں میری ماں سوئی ہوئی تھی، اپنے دل میں کئی ادھوری حسرتیں لئے ——— بیٹے کے بیاہ کی ——— بیٹی کی وداعی کی، پوتے کھلانے کی، نواسے جھلانے کی ——— آج یہ سب حسرتیں ہمیشگی کی نیند سو رہی ہیں میری ماں الوداع ——— الوداع ———

بھائی میاں کے کمرے کی طرف منہ کرکے میں کتنی ہی دیر یونہی کھڑی رہی ———

اے مالک تونے عورت کے سینے میں اتنا درد کیوں بھر دیا ——— ؟ جو اُسے دکھ دیتا ہے، اُسے ہی پیار کرتی ہے ——— جو اس سے نفرت کرتا ہے۔ اسی سے محبّت کرتی ہے ——— تونے عورت کا دل، بہن کا دل اتنا درد مند کیوں بنایا ——— ؟؟ الوداع میرے بھیّا ——— الوداع ——— زخموں کے نشان جب تک میرے جسم پر رہیں گے پھول بن بن کر مہکیں گے اور تمہاری یاد دلائیں گے ——— آج تمہارا پیار دولت کے انبار تلے دب گیا ہے مگر کبھی تو تمھیں اس دل کی یاد آئے گی جس کی ایک ایک ادا پر تم دل سے ہنستے تھے خوش ہوتے تھے پیار کرتے تھے ——— مُسکراتے تھے ——— الوداع ———

دروازے سے سر لگا کر میں کتنی ہی دیر کھڑی رہی ——— رات آہستہ آہستہ یوں جا رہی تھی جیسے کوئی دلہن میکے سے پہلی بار سُسرال کو چلے ——— ! قدموں میں وہی بوجھل پن۔ ——— دل میں وہی غم ——— آنکھوں میں وہی ستارے ——— آج دو دلہنیں اپنے اپنے میکوں سے لوٹ رہی تھیں ——— اے رات تیرا پیا تو افق کے اس پار تیرا منتظر ہے ——— تیرا پیا تو سورج کا تلک لئے تیری راہ تک رہا ہے ——— دیکھتے ہی دیکھتے تو محبت کی دہلیز پر قدم دھر دے گی اور تیری زندگی میں صبح کا نور بھر جائے گا۔ ——— مگر میں ؟ میں کون سے پیا کی منتظر ہوں ——— ؟؟ میری پیشانی پر کون سے سورج کا ٹیکا جھمکیگا ——— ؟؟ میں کون سے دیش کو جا رہی ہوں ——— ؟ غم کی ڈولتی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ میرے دل میں پیار کی روشنی، امیدوں کی کرنیں اور اور محبت کے پھول کیوں نہیں مہک رہے ——— ؟ میں کہاں جا رہی ہوں ———

کہاں ——— ؟؟؟

میں نے ایک بار پیچھے پلٹ کر دیکھا اور پھر آگے بڑھتی چلی گئی ——— تو سنا تم نے۔ ؟ میں گھر سے نکل گئی ——— اور آج مجھے گھر سے نکلے پانچواں دن ہے ——— پانچواں ——— اور ان پانچوں دنوں میں زندگی سے جی بھر گیا ہے ——— ان پانچوں دنوں کی کہانی بھی تمھیں سُنا دوں پھر میرا دل ہلکا ہو جائے گا ——— پھر مجھے یہ غم نہیں رہیگا کہ

دنیا میں کسی نے میری داستانِ غم نہ سنی کہ ایک لمحے کو ہی سہی، جی ہلکا تو ہو جاتا ہے ——

—— تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ——؟

میں گھر سے نکل تو گئی مگر معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں گی ——؟ کدھر جاؤں گی ——؟

ایک جوان اور خوبصورت عورت کے لئے دنیا میں جگہ ہو بھی کہاں سکتی ہے ——؟ میں صبح تک چلتی رہی —— جب سورج نے ہر طرف روشنی بکھیرنی شروع کی، میں ایک نل کے پاس کھڑی تھی —— میں نے چلوؤں میں پانی لے کر اپنا چہرہ دھویا اور جب گرد آلود بال جھٹکانے لگی تو نل کے پاس کھڑی عورتیں مجھ سے پوچھنے لگیں ——

"کیا تم عورت ہو ——؟"

میں ہنسنے لگی —— عورت ہوں اسی لئے تو یہ دکھ اٹھانے پڑ رہے ہیں ——

میں نے دل میں سوچا ——

میری ہنسی پر وہ اور حیرت زدہ ہوئیں اور آپس میں بولنے لگیں —— "صبح صبح آوارہ روحیں بھٹکا کرتی ہیں —— یہ تو کوئی ہم تم جیسی عورت نہیں معلوم پڑتی جی ——"

اور وہ اپنے مٹکے اور گھڑے اٹھائے گھروں کو بھاگنے لگیں —— مجھے پھر ہنسی آگئی —— آج سارا زمانہ مجھ سے دُور بھاگ رہا ہے، میرے دل نے درد کے ساتھ سوچا —— میں نے آواز دی —— "میں روح نہیں ہوں —— ایک دکھیا عورت ہوں —— میری بات تو سن لو، میرے دل کا درد تو دیکھ لو ——" مگر وہ پیچھے نہ پلٹیں —— میں ہی آگے بڑھ گئی ——!

میں اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتی بڑھتی ہی، چلتی رہی —— ایک آدمی نے مجھے دیکھکر آنکھ ماری —— میں دکھ سے مسکرا دی —— عورت کے لئے کہیں جائے قرار نہیں —— یہاں ہر آدمی نواب ہے جو پیسے دے کر عورت کو خرید لینا چاہتا ہے —— میں اس کے قریب پہنچی اور کمزور آواز سے بولی ——

"بھائی صاحب آپ......"

اس نے ذرا غور سے میری صورت دیکھی اور پھر بوکھلا کر پلٹ گیا ——— "ہونہہ ——— بھائی صاحب ——— !"

دنیا کس قدر گندی جگہ ہے ——— دیکھا تم نے ——— ؟ ایک مرد عورت کو آنکھ مار کر اشارہ کر سکتا ہے کہ چل میرے ساتھ ——— لیکن عورت اگر اسے بھائی کا ساپوتر رشتہ لگا کر سہارا مانگتی ہے تو وہ ہونہہ کہکر آگے بڑھ جاتا ہے ———

میں نے پھر اپنے بے جان قدم بڑھائے ——— اتنے دنوں گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہی، چلو آج موقع ہاتھ آیا ہے تو دنیا اور دنیا والوں کو ایک نظر دیکھ تو لوں اور میں پھر چلنے لگی ——— صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام اور شام کے بعد رات آئی اور پھر میرے زخم جاگنے لگے ——— یہ زندگی کی پہلی رات تھی کہ میں اپنے گھر سے، اپنی ماں سے، اپنے بھائی سے دور رہ کر سو رہی تھی ——— مگر کہاں ؟؟ چلتے چلتے میں قبرستان تک آنکلی تھی ——— میں نے سوچا ہم جیسوں کا سب سے اچھا گھر تو یہیں بن سکتا ہے ——— مگر میں نے کہا نا کہ غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہے ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی راہ نہیں ——— زندگی اپنے بس کی نہیں، موت بھی بس کی نہیں ——— چھوٹی بڑی قبروں کے بیچ میں وہیں لیٹ گئی ——— اور کوئی موقع ہوتا تو شاید میں ڈر سے لرز لرز جاتی، مگر آج کی بات اور تھی ——— پے در پے صدموں اور تنہائیوں نے جیسے ڈر کا احساس ہی چھین لیا تھا اور میں مزے سے قبر کے پہلو بہ پہلو لیٹی تھی جیسے سہاگ رات منا رہی ہوں۔

پھر صبح ہو گئی ——— مگر میری زندگی کی صبح کہاں تھی ——— ؟ اور کون جانے میرے نصیبوں میں کتنی راتوں کی سیاہی لکھی ہوئی تھی ——— ؟؟ بھوک سے میری چال ڈگمگا رہی تھی ——— آنکھوں میں سیاہ دھبے ناچ رہے تھے اور چکر کے مارے قدم اٹھانا محال تھا، مگر میں چلی جا رہی تھی ——— ایک جگہ جا کر میں ٹھٹھک گئی ——— بہت سارے مرد، بچے اور چند عورتیں کسی کو گھیرے میں لئے کھڑی تھیں، میں نے جگہ بنا کر، جھانک کر دیکھا ——— گھنگھروؤں کی تال پر کوئی الھڑ سی عورت چھم چھم ناچ رہی تھی اور کوئی کوئی دل والا

آے دو آنے بھی پھینک دیتا تھا ــــــ !

"ہاں زندگی کا ایک روپ یہ بھی ہے ــــــ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا اور پھر ہلکے ہلکے قدم اٹھانے لگی ــــــ بڑی دیر چلتے رہنے کے بعد آخر میں ایک نیم کے نیچے بیٹھ گئی ــــــ "ناچنا شروع کردوں ــــــ ؟" میں نے بہت صلاحیت کے ساتھ سوچا ــــــ پھر خیال آیا عورت ہوکر تو زندہ رہنا ہی مصیبت ہے ــــــ دل والے مجھے کب زندہ چھوڑیں گے ــــــ ؟ اس عورت کی بات اور تھی، اس کے ساتھ اس کا ایک رکھوالا بھی تو تھا ــــــ عورت کے لئے رکھوالے کا وجود بھی کس قدر ضروری ہے ــــــ ؟ بغیر سہارے کے تو یہاں پتّہ بھی نہیں ہل سکتا ــــــ

اُف ــــــ میں کس قدر نیچ ہوگئی ہوں ــــــ سڑکوں پر ناچنا ــــــ ؟ بھلا کسی نے ایسی ذلیل بات سوچی بھی ہوگی ــــــ ؟ اُف یہ پیٹ !!

بھوک کا شدید احساس پھر سے جاگنے لگا اور میں للچائی ہوئی نگاہوں سے اس فقیر کو دیکھنے لگی جو ابھی ابھی پتّے کے دونے میں سالن لئے چپڑ چپڑ روٹی سے کھا رہا تھا ــــــ میں نے بہت دیر تک اسے دیکھا ــــــ مگر اس نے میرا کوئی نوٹس نہ لیا، شاید وہ صورت سے مجھے کوئی بہت امیر کبیر لڑکی سمجھ رہا ہوگا ــــــ بڑی دیر بعد میں نے کچھ اس انداز میں، جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں، کہنا شروع کیا ــــــ (مگر دراصل میں اس فقیر سے مخاطب تھی)

"میں بڑی دکھیا ہوں......"

اس نے ایک لمحے کو تو حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر دوسرے ہی لمحے ٹانگیں جھاڑتا ہوا یہ کہہ کر چل دیا ــــــ "اونہہ یہاں سبھی دکھی ہیں ــــــ کون کس کس کا دُکھڑا سنتا پھرے۔"

میں اس جگہ گئی جہاں وہ بیٹھا تھا ــــــ روٹی کے چند ٹکڑے ادھر ادھر گر گئے تھے، میں نے جلدی جلدی ہاتھ مار کر سمیٹے اور ندیدوں کی طرح منہ میں بھرنے لگی ــــــ

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ــــــ ؟؟ ہاں یہ میں تھی میں ــــــ جو ایک فقیر کے آگے کے ٹکڑے چن چن کر کھا رہی تھی ــــــ مگر مجھے اب حیرت نہیں ہوتی، کیونکہ اس

اس دنیا میں رہکر میں نے جانا ہے کہ انسان کو ذلیل کرنے والا یہ پیٹ ہی تو ہوتا ہے ——
خالی پیٹ —— اور یہ نہ بھولو کہ اُس لمحہ میرا پیٹ بھی خالی تھا ——
یہ دوسرا دن تھا جو میں گھر سے الگ تھی —— چند ٹکڑے کھا کر میری آگ اور بھڑک گئی —— پتہ نہیں کیا جی چاہ رہا تھا —— کسے کھاؤں —— کسے پھاڑ ڈالوں ——
میں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی بڑھی —— ایک جگہ کچرے کے ڈبے کے پاس کیلے کے چھلکے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بغیر کسی تکلف یا شرم کے وہ چھلکے اُٹھا لئے اور جلدی جلدی منہ چلانے لگی —— اب میں پھر اُسی نیم تلے آ بیٹھی تھی اور راہگیر مجھے آتے جاتے بڑی شوق بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے —— ایک موٹے سے سیٹھ نے مجھے حد درجہ مکروہ انداز میں آنکھ مار کر دیکھا —— میں نے متزلزل ہو کر اُسے دیکھا —— پارسائی اور بے حیائی میں بڑی کشمکش ہو رہی تھی —— کوئی ادھر کھینچ لیتا کوئی اُدھر —— میں بیچ میں ادھ مری سی بیٹھی تھی ——
چھی چھی چھی —— یہ میں کیا سوچنے لگی —— کیا میں اتنی نیچ تھی —— ؟؟ کیا زندہ رہنا ایسا ہی ضرور ہے —— ؟؟ کیا پیٹ کے لئے انسان اتنا بھی نیچ ہو جایا کرتا ہے —— پھر کیا یہ تم سوچ رہی ہو تم —— تم اپنی خاندانی روایات بھول گئیں —— دلی کی تمہاری شاندار حویلی —— تمہارے گھرانے کی وہ عزت —— تمہاری وہ لوگوں کے لئے قابل تقلید زندگی —— اب تم اپنا جسم بیچو گی —— ؟؟ ہر رات ایک نئی سیج سجا کر، نئے نئے مردوں کے ساتھ سویا کرو گی —— ؟؟ میں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں بھر لیں —— !
"نہیں نہیں میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا بھی نہیں —— میں سوچ بھی نہیں سکتی بند کرو یہ بکواس ——"
اور پھر سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا —— بیٹھے بیٹھے ہی جانے کتنے جگ بیت گئے —— مگر وہ تصور کی دنیا تھی —— حقیقت تو یہ تھی کہ صرف سہ پہر کا وقت بیت رہا تھا

اور دھوپیں تڑپتی ہو رہی تھیں۔ میں بلا کسی ارادے اور مقصد کے یونہی بے دلی سے اٹھی اور چلنے چلی ـــــ رکی تو میں ایک ہاسپٹل کے سامنے تھی ـــــ مریضوں کے رشتے دار آجا رہے تھے اور کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ دو گھڑی کو رک کر میرا حال بھی پوچھ لیتا ـــــ اب دل برداشت کی حد سے اس طرح باہر ہو رہا تھا کہ جی چاہتا تھا چلا چلا کر ساری دنیا کو سنا دوں۔ ـــــ دیکھو میرے دل کے گھاؤ دیکھو ـــــ میں وہ بدنصیب لڑکی ہوں جسے اس کے سگے بھائی نے بیچ دیا ـــــ دیکھو روپے کی طاقت کیسی ہوتی ہے کہ ماں جایا ایک بہن کے جسم سے خون کے فوارے اڑا دیتا ہے اور یہ پیٹ کی آگ ......

مگر کوئی نہ تھا ـــــ کوئی نہ تھا ـــــ چپراسی نے مجھے وہاں رکا دیکھ کر پوچھا ـــــ

"اے لڑکی ـــــ تم وہاں کیوں کھڑی ہو ـــــ"

میں نے خوشی خوشی زبان کھولی ـــــ "بابا ـــــ میرا اس دنیا میں اب ......"

"یہاں ہم لوگوں کے دکھڑے سننے نہیں کھڑے جی ہسپتال میں جانا ہے تو جاؤ ورنہ راستہ چھوڑ دو، موٹریں آرہی ہیں ـــــ"

تو یہاں کوئی بھی نہیں جو کسی بے کس کی ہائے ہی سن لے ـــــ یہ کیسی دنیا ہے مولیٰ تیری ـــــ یہ کیسی زندگی ہے خداوندا ـــــ ؟؟ میں وہیں پرے ہٹ کر ایک کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

میری زندگی میں آوارگی کا کوئی گذر نہ تھا ـــــ ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی اپنے لئے کوئی راستہ ڈھونڈھ ہی لیتی ـــــ مگر میں نے تم سے بتایا نا کہ میں ایک شریف اور اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی ـــــ بدچلنی کا میرے پاس ایک سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ـــــ اپنا جسم بیچ کر اپنے دوزخ کی آگ بجھانا ـــــ اس فلسفے کو ماننے کی میرے دل میں تاب نہیں ـــــ

میں پھر چلنے لگی ـــــ چلتے چلتے میں شہر کے پر رونق بازار میں آگئی ـــــ ہر طرف رنگ و بو کا سیلاب تھا ـــــ موٹریں اڑ رہی تھیں، عورتیں زرق برق کپڑے

پہنے اتراتی پھر رہی تھیں ——— آدمیوں کا ہجوم تھا کہ بس چلا جا رہا تھا —— ایک دریا کی مانند رواں دواں ——— میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو چار موٹریں رکیں، اسی طرح کھمبوں کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی عورتوں کو اشارے سے پاس بلایا گیا اور موٹر زوں زوں یہ جا، وہ جا ——— !

" بیٹھ جاؤں میں بھی کسی موٹر میں ——— " میں نے دل سے سرگوشی کی —— ؟ چھی چھی ——— ایسا سوچنا بھی پاپ ہے ——— یہاں تو میں بس اس لئے کھڑی ہوں کہ زندگی کا تماشہ دیکھوں ———

میں جانے کب تک تماشہ دیکھتی رہتی کہ اکدم کسی نے میرا کندھا تھپ تھپا کر کہا —— " کیا آپ چند لمحے میرے ساتھ گذار سکتی ہے ——— "

میں نے لرز کر دیکھا ——— ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا ——— نیلے سرج کے سوٹ میں ملبوس ——— سر کے بالوں میں اکا دکا سفید بال بھی چمک رہا تھا ——— اونچا قد اور چہرے پر عجب بے بسی چھائی ہوئی تھی ——— میں نے پھر اسے غور سے دیکھا، اس کے تیور آوارہ گردوں کے سے نہ تھے ——— وہ خود بھی مصیبت کا مارا سا دکھائی دے رہا تھا۔

" میں آپ ہی سے مخاطب ہوں ——— " وہ بڑی شائستگی سے بولا ——— " کیا آپ چند لمحوں کے لئے چل کر اس ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھ سکیں گی ——— ؟ "

میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور جدھر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا، اُدھر چلنے لگی ———

ہم دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے اور اس نے آگے بڑھ کر میرے لیے ایک کرسی کھینچی اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا ———

زندگی کا یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں ہوٹل میں آئی تھی ——— میں حیران حیران نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی ——— چھت پر بجلی کے پنکھے چل رہے تھے ——— سارے میں کپوں اور برتنوں میں کھڑ کھڑ ہو رہی تھی ——— سگریٹ اور سگار کے دھوئیں کے بگولے

چھا رہے تھے اور ٹھنڈی روشنیوں میں یہ سب کچھ عجیب خواب کی سی بات لگ رہی تھی ———

——— ہمارے اطراف چند مرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے ——— جیسے ہی انھوں نے مجھے دیکھا مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ———

شاید میرے کپڑوں کی ہنسی اڑا رہے ہوں! ——— میں نے دل میں سوچا اور بوکھلا کر نگاہیں جھکالیں ———

اس شخص نے بُوائے کو جانے کیا کیا الا بلا لانے کا حکم دے دیا تھا ' اور اب میز لدی ہوئی تھی اور میری آنکھوں میں جیسے ستارے ناچ رہے تھے ——— اس نے مجھے تکلفاً "لیجئے نا" ——— کہا اور میں جیسے پل پڑی ———

وہ دھیمے سروں میں گویا ہوا ———

"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ——— ؟"

اس کے اس جملے پر مجھے اپنے سارے دُکھ یاد آ گئے ——— میرا تیزی سے کام کرتا ہاتھ رُک گیا اور میں بے بسی سے بولی ———

"میں بہت بدنصیب لڑکی ہوں ——— آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں کن مصیبتوں میں گھری ہوئی ہوں ......"

اس نے میری بات یونہی کاٹ دی ——— "آپ اپنے دکھ ایک لمحے کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھئے، پہلے میری بات سنئے ———"

مگر میں اس کی بات نہیں سن رہی تھی ——— کوئی بھی ایسا دل والا نہیں ملتا جو کسی غم نصیب کے دکھ کو اپنے سینے میں منتقل کرے ——— وہ مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا ———

"آپ جانتی ہیں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ——— ؟؟ آپ جیسی عورتوں کو رات گزارنے تو بہت سے مرد لے جاتے ہوں گے مگر" ——— مگر اس کے بعد میں نے کچھ نہ سنا ——— آپ جیسی عورتیں ——— آپ جیسی عورتیں ——— آپ جیسی عورتیں....

ہوٹل میں جیسے طوفان آ گیا تھا ——— بادلوں کی گرج اور جہازوں کی گھڑگھڑاہٹ

سے بھی بڑھ کر کوئی گونج گرج تھی جو مجھے ہلا رہی تھی تھرّا رہی تھی ——

آپ جیسی عورتیں ——

آپ جیسی عورتیں ——

میں نے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے اور تیزی سے اٹھ بھاگی —— بھاگتے میں میز پر سے دو تین طشتریاں اور کپ لڑھک گئے اور برتنوں کے شور اور قہقہوں کی گونج میں، میں بھاگتی ہی چلی گئی —— باہر آکر میں نے لمبی سانس لی ——

یہ میری پارسائی کا انعام تھا —— یہ میری ریاضت اور پاکیزگی کا صلہ تھا —— یہ دنیا —— جہاں دلوں کا درد کوئی نہیں دیکھتا —— تسلّی کے دو بول کوئی نہیں کہتا مگر جہاں الزام خوب تراشے جلتے ہیں —— عزتیں خوب لوٹی جاتی ہیں —— کہاں جاؤں؟ —— کہاں جاؤں —— ؟

میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا —— آسمان روشن تھا۔ پاس پاس ستاروں کے گچھے چمک رہے تھے —— اور ان سبھوں کے بیچ میں چاند تھا جو تیرتا چلا جا رہا تھا —— اپنی منزل کی طرف ——

مجھے بھی روشنی دے دے —— مجھے بھی اجالے دے دے —— میں دکھے دل کو تھام کر بے بسی سے بولی —— میں بھی اپنی منزل کو جانا چاہتی ہوں —— مجھے روشنی چاہیئے —— مجھے زندگی چاہیئے ——

اور میں وہیں گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھ گئی —— اور پھر میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں زمین پر گری جا رہی ہوں —— میرے کانوں میں شور کی آوازیں —— اور راہگیروں کے قہقہے ہلکے اور ہلکے —— اور ہلکے ہوئے جا رہے تھے۔ میرے سامنے ہسپتال کی بلند و بالا دیواریں تھیں اور —— پھر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا ——

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک بستر پر پایا —— میں ہسپتال کے بستر پر پڑی ہوئی تھی —— سفید سفید لباس پہنے ٹک ٹک کرتی نرسیں ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر

آجارہی تھیں ــــــ اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے ڈاکٹر، مریضوں پر مہربان نظریں ڈالتے ہوئے آجارہے تھے ــــــ ایک نرس قریب سے گزری تو میں نے پوچھا ــــــ
"مجھے یہاں کس نے لاکر ڈال دیا ہے ــــــ؟"

نرس رُک کر بولی ــــــ "ہمارے کونئیں ماوم ــــــ مریضوں کو اُدھر سے اڈمٹ کرتے ہیں ــــــ کوئی تمھارے بھائی بند ہی لاکر ڈالے ہوں گے ــــــ"

میرا بھائی بند ــــــ! ہونہہ! ایک زہر خند مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔

دو دن میں نے ہاسپٹل میں کاٹے ــــــ نرسیں مشین کی طرح مصروف رہتیں ــــــ ڈاکٹر ٹائم سے آتے اور جلدی جلدی چلے جاتے ــــــ بازو کے بیڈ والے پیشینٹ کو اپنی ہائے ہائے سے فرصت نہ تھی ــــــ پُورا وارڈ ہی آہوں اور کراہوں کا مسکن تھا ــــــ کون کس کا دکھ سننے چلا تھا ــــــ

ایک دن میں نے ڈاکٹر کے کوٹ کا دامن تھام ہی لیا ــــــ "ڈاکٹر صاحب میرے دل میں ہر دَم اک آگ سی لگی رہتی ہے ــــــ اس آگ کو بجھانے کی کوئی صورت بھی ہے ــــــ؟"

ڈاکٹر صاحب نے نرس کو آواز دی ــــــ "سسٹر ــــــ ٹمپریچر لو ــــــ دماغ پر گرمی کا اثر معلوم ہوتا ہے ــــــ بڑبڑا رہی ہے ــــــ" میں نے تکیئے پر سر پٹخ دیا ــــــ میں پاگل نہیں ہوں ــــــ میرے دماغ پر گرمی نہیں ہے ــــــ میں سب کچھ سوچ سمجھ سکتی ہوں ــــــ سب جانتی بوجھتی ہوں مگر بس کہتی ہوں کوئی مجھ سے کبھی ہمدردی بھی جتائے گا یا میں یونہی مرجاؤں گی ــــــ؟

نرس نے آکر لال شال سر سے پیر تک اوڑھادی ــــــ
"اتنا پکار امت کرو بی بی ــــــ دوسرے پیشینٹ جاگ جائیں گے ــــــ" اور وہ میرے منہ میں تھرمامیٹر کی نلکی دے کر چلی گئی ــــــ

میں نے تھرمامیٹر مُنہ سے نکال کر رکھدیا اور جب نرس آئی تو اس سے بڑی لجاجت

سے بولی ـــــ "مجھے کھانا چاہیئے بھوک لگ رہی ہے ـــــ"

"اتنے بخار میں کھانا نہیں دیا کرتے ـــــ چین سے سو جاؤ ـــــ اُٹھنے بعد دودھ پی لینا ـــــ موسمبی یہ رکھی ہے ـــــ" اور وہ بیزر تیکھتی چلی گئی ـــــ

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ـــــ ڈاکٹروں کی راؤنڈ کا ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ نرسیں اپنے اپنے کاموں میں تھیں ـــــ مریض بستروں پر پڑے ہائے وائے کر رہے تھے۔ پورے وارڈ میں عجیب سناٹا پھیلا ہوا تھا ـــــ کیسی غیر دلچسپ زندگی ہے خدایا۔ دو ایک دن میں ڈسچارج ہو جاؤں گی ـــــ پھر وہی زندگی اور وہی زندگی کے ستم! یہ دو دن کا آرام بھی کون بھلا لگ رہا ہے مجھے ـــــ؟ میں نے پڑے پڑے موسمبی کھائی اور دھیرے دھیرے اپنے جسم کو اٹھ بیٹھنے پر آمادہ کیا ـــــ بڑے سے وارڈ میں سے ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی میں باہر نکل آئی ـــــ دروازے پر چپراسی نے پوچھا ـــــ

"کہاں جا رہی ہو ـــــ؟"

"گھر ـــــ" میں ایک ہی لفظ بول سکی ـــــ اور اس ایک لفظ نے پھر میرے دل میں غم ہی غم بھر دیا ـــــ

وہ غیر یقینی انداز میں بولا ـــــ "مگر ٹکٹ کہاں ہے ـــــ؟"

میں چڑ کر بولی ـــــ "تو کیا میں یونہی بھاگی جا رہی ہوں ـــــ؟"

میرے لہجے سے وہ ذرا سہم گیا اور بازو ہٹ گیا ـــــ میں دھیرے دھیرے ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل گئی ـــــ

اور آج پانچواں دن ہے کہ میں گھر سے باہر ہوں ـــــ اس گھر سے بھی جہاں میں اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور اس گھر سے بھی جہاں تصور ہی میں سہی مگر میں شوہر اور چھ بچوں کے ساتھ سکون سے رہتی تھی ـــــ گھر! جس کی لال اینٹوں کی دیواریں تھیں اور جس کے پھاٹک پر بوگین ویلیا کے قرمزی رنگ کے پھول ہرے ہرے پتوں میں چھپے مسکراتے جھومتے تھے ـــــ!

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ــــــ ؟؟

وہی حیدرآباد کی سڑکیں تھیں ــــــ وہی راہگیر ــــــ وہی چہل پہل ــــــ اور وہی میں، جس کا دل قبرستان تھا ــــــ جہاں کئی آرزوئیں پہلو بہ پہلو سو رہی تھیں جنھیں خدا کا ہاتھ بھی زندہ نہیں کر سکتا تھا ــــــ میں بھوک سے نڈھال تھی۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ــــــ میری ساڑھی دھول اور گرد سے اٹ گئی تھی۔ میرا دل دکھی تھا، جسم بے جان اور میرے آس پاس مکروہ چہرے تھے اور بھوکی نگاہیں ــــــ دل جیسے بار بار بجھاتا تھا ــــــ

ایک ہی راستہ ہے ــــــ ایک ہی راستہ ہے ــــــ چل پڑو ــــــ چل پڑو ــــــ پھر نہ دکھ ہوں گے نہ غم ــــــ بس خوشیاں ہی خوشیاں ــــــ ہاں ایک ہی راستہ ہے.......

کیا اس راستے کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہے ــــــ ؟؟ کیا دنیا میں ایک بے سہارا عورت کے لئے، سوائے چھلکے کے اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ــــــ کیا سارے راستے اسی منزل پر آکر ختم ہوتے ہیں ــــــ ؟؟ اور یونہی قدم اٹھاتے اٹھاتے میں تم تک آ پہنچی ــــــ اور جیسے میرے دل میں ایک ساتھ کئی چراغ جل اُٹھے۔

ارے ــــــ! مجھے پتہ ہی نہ تھا ــــــ تم سے بڑھ کر اور کون منزل ہو سکتی ہے؟ ــــــ تم نے کتنوں کو سہارا دیا ہے ــــــ؟ کتنوں کے غموں کی پردہ پوشی کی ہے، کتنی آنکھوں کی فریادیں سنی ہیں ــــــ کتنے دکھوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے ــــــ میں ــــــ میں بھی تو اسی درد کی ماری ہوئی ہوں ــــــ مجھے بھی تو یہاں پناہ مل سکتی ہے نا ــــــ! اے دریائے موسیٰ ــــــ اے مہربان!

میں نے اپنے گرد آلود پاؤں پانی میں ڈال دیئے اور تم سے باتیں کرنے لگی ــــــ انسانوں کے دلوں سے اچھا تو تمھارا دل ہے ــــــ تم میری پکار اور غم زدہ آواز سن کر بھاگے نہیں ــــــ ورنہ یہاں کون کسی کا دکھ سمیٹتا ہے۔ تم اسی متانت اور سکون سے

بہہ رہے ہو ـــــ تمھارے دل میں ساروں کے غم سمیٹ کر بھر لینے کی وسعت ہے ـــــ اوروں کی طرح تم نے بےزار ہو کر منہ نہیں پھیرا، ہاتھ نہیں جھٹکا، طعنے نہیں دیئے اور غور سے میری باتیں سنتے رہے ـــــ

کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں ـــــ ہاں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں بس خواب میں ہی تو نظر آتی ہیں ـــــ رستی بستی زندگیاں اور کیسے اُجڑا کرتی ہیں ـــــ؟؟

تمھارا یہ سکون ـــــ تمھاری یہ خاموشی ـــــ کیا سچ تم نے میری باتیں غور سے سنی ہیں ـــــ؟

ہاں ہاں سنی ہیں، تبھی تو میرے دل کا بوجھ اب ٹل گیا ہے ـــــ میں ہَوا کی طرح ہلکی ہو گئی ہوں ـــــ تمھارے دل کا سا سکون میرے اپنے دل میں رچ بس گیا ہے اور میں اب مرتے مرتے کس قدر مطمئن ہوں ـــــ! کس قدر خوش! ـــــ

کہیں یہ نہ کہنے لگنا، کس قدر بزدل اور ڈرپوک تھی جو یوں دنیا سے منہ پھیر لیا ـــــ ذرا دل پہ ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ مجھ ایسی لڑکی کے لئے، آج دنیا کی ترقی یافتہ دنیا میں اور کون راستہ تھا ـــــ؟؟ اور کون منزل ہو سکتی تھی ـــــ؟؟ میں نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے ـــــ اور اب میں کس قدر خوش ہوں ـــــ میں اب دھیرے دھیرے پانی میں اُتر رہی ہوں ـــــ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی میرے جسم کو چھو رہا ہے اور میں زندگی سے قریب ـــــ اور قریب ـــــ اور قریب ہوتی جا رہی ہوں

عبداللہ حسین

پھول کا بدن

"اور؟" لڑکی نے پوچھا۔

"اونہوں۔"

"ایک پیالی اور۔"

"نہیں۔ شکریہ۔"

"ایک تو اور۔"

"ارے نہیں بھئی۔" اس نے تنگ آ کر کہا، "تم جانتی ہو میں چائے نہیں پیتا۔"

"نہیں۔"

"نہیں کیا؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"کیا؟"

"میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"ایں؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

کیونکہ وہ اس لڑکی کو ایک مدت سے جانتا تھا۔

اور اس کے گھر والوں کو اور اس کے شوہر کو اور سب کو، اتنی اچھی طرح سے کہ ان کے گھرانے کا ایک فرد تصور کیا جاتا تھا، اتنی مدت سے کہ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہ رہا تھا۔ شاید جب سے کہ جب وہ

اور اس کنبے کا بڑا لڑکا سکول میں پڑھتے تھے اور وہ ایک سال آگے تھا اور پھر وہ فیل ہوگیا تھا اور دونوں ساتھ ساتھ پڑھنے لگے تھے اور دونوں کی کسی بات پر سخت لڑائی ہوگئی تھی اور دونوں کو سزا ملی تھی، جب چھٹی کے بعد تک ایک تختی لکھتا اور دوسرا اسکول کے پودوں کو پانی دیتا رہا تھا اور بعد میں گلے میں بستے لٹکائے ایک دوسرے سے بظاہر بے خبر آگے پیچھے چلتے گھروں کو لوٹے تھے اور شام کو کسی بات پر دونوں کی صلح بھی ہوگئی تھی آپ سے آپ اور بڑی پکی دوستی بھی ہوگئی تھی جو بڑھتی ہی گئی تھی اس لئے کہ دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ابھی بہت چھوٹے تھے، اتنے کہ ابھی دوسری جماعت میں پڑھتے تھے۔ یا شاید اس سے بھی پہلے سے۔ جب ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے تھے اور اس نے ابھی سکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا اور وہ دن بھر ان کے دروازے پر کھڑا مردوں عورتوں اور بچوں کو اندر باہر آتے جاتے اور سامان کو منتقل ہوتے اور دروازے کھڑکیاں چٹاخ پٹاخ کھلتے بند ہوتے اور گرد کے بادلوں کو اڑتے ہوئے دیکھتا رہا تھا اور صرف دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے گھر گیا تھا اور پھر بھاگ کر وہاں آ کھڑا ہوا تھا اور دیکھنے لگا تھا اور بچوں کی ماں نے ایک دفعہ اس سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے اور وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا تھا اور پھر عورت نے اسے اندر آجانے کے لئے کہا تھا اور وہ اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوا تھا اور نہ بولا تھا اور عورت اس سے اکتا کر اندر چلی گئی تھی اور اس کے بعد وہ کئی روز تک دور دور سے بچوں کو دیکھتا اور ان سے مانوس ہوتا رہا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد بھی نہ رہا تھا کہ کب سے۔

”تم جانتی ہو“ اس نے کہا ”تم مجھے اچھی طرح سے جانتی ہو“

”نہیں“

اور پہلی بار، تقریباً پہلی بار اسے اسقدر ضدی، سرکش اور قطعی لہجے میں بات کرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کئی بار آنکھوں کو جھپکا اور پھر آنکھیں پھیلا کر سامنے بیٹھی ہوئی اس لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی کیونکہ شام ہونے ہی تھی اور کسی نے اٹھ کر بتی نہ جلائی تھی اور دھندلکے کی نرم اور معدوم روشنی میں سفید چینی کے چائے کے برتن جھلملا رہے تھے اور وہ ان پر جھکی ہوئی بیٹھی تھی اس کے مقابل اس طرح سے کہ اس کا ایک ہاتھ خالی پیالی میں چمچہ گھما رہا تھا اور دوسرا گود میں پڑا تھا اور اسکا سر سیاہ اور گھنے بالوں والا اس کی نظر کے سامنے تھا اور چہرہ جھکا ہوا تھا گو اسکو پتہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر سرخی نہیں تھی کہ کچھ دیر قبل جب ابھی روشنی تھی اور وہ بیٹھے

چائے پی رہے تھے اور گھلے ملے دوستوں کی طرح بیچ بیچ میں کوئی کوئی بات کئے جا رہے تھے تو اس نے یہ سب دیکھا تھا۔ کہ وہ اس لڑکی کو اتنے عرصے سے جانتا ہے، یہ سوچ کر اس کے دل میں افسوس پیدا ہوا۔

"میرا نام نعیم ہے" اس نے کہا۔

"اچھا — اچھا!" لڑکی نے چہرہ اٹھایا جو مجسم تمسخر تھا۔

"تمھارا نام ثروت ہے"

"ٹھیک"

"پھر؟"

"میں کچھ نہیں جانتی"

اور اس نے کچھ اس طرح سے 'کچھ' کہا کہ وہ گویا بجلی کا جھٹکا لگنے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب ایک نامعلوم لاچار غصہ اس کے دماغ کو چیرنے لگا۔ کمرے میں تاریکی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ایک گزرتی ہوئی موٹر کی روشنیاں ایک لحظے کے لئے ان کے چہروں پر پڑیں اور غائب ہو گئیں۔

"اٹھ کر بتی جلاؤ" اس نے کہا۔

"نہیں"

"بتی جلاؤ" وہ چیخا۔

"اندھیرا اچھا لگتا ہے" لڑکی کی گہری مختصر ہنسی کی آواز آئی "اندھیرے میں چیزیں اچھی لگتی ہیں"

اگر وہ اس لب و لہجے کا، اس رویے کا اس سے ذرہ بھر بھی متوقع ہوتا تو شاید اپنا دماغ نہ کھوتا کیونکہ بہت سی باتیں جو ہم کرتے ہیں جن پر ہم پیچھے پچھتاتے ہیں ہم اس لئے کرتے ہیں کہ اول ان حالات کے کہ جن کے سبب وہ ہوتی ہیں ہم متوقع نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ بتی جلانے کے لئے اٹھا تو گھٹنے کی ٹھوکر سے چائے کی میز کو الٹ گیا۔ بعد میں وہ اسی ایک واقعہ سے — یا کسی ایک واقعہ سے — یعنی ایک ٹوٹی ہوئی پیالی اور تھوڑے سے دودھ اور تھوڑی سی چائے اور تھوڑی سی شکر کو فرش پر بکھرے ہوئے دیکھ کر یا شاید لڑکی کو اسی طرح چمچہ ہاتھ میں لئے خاموش اور لاتعلق اور خودمختار بیٹھے ہوئے پا کر یا شاید اس سے بھی پہلے اندھیرے میں گرتے اور ٹوٹتے ہوئے برتنوں کے شور کو سن کر ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔

"یہ تمھاری غلطی سے ہوا۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اندھیرے میں" وہ بولی، "چیزوں کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ حسن بڑھ جاتا ہے۔"

"کیسے؟"

"ایسے کہ نظر کا راستہ رک جاتا ہے۔" وہ بولی، "پھر خیال تیز ہو سکتا ہے۔ کیا جا سکتا ہے۔"

"تمھارے سر میں کیا سما گئی ہے؟"

"ایک فائدہ" وہ بولی، "اور ہوتا ہے۔ آنکھوں کو آرام ملتا ہے۔"

"تمھارا دماغ چل گیا ہے شاید۔"

وہ آکر کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ واقعے کے اچانک پن نے اسے دفعتاً بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔ اس لئے کہ اتنا عرصہ ہو گیا تھا اور ہمیشہ اس لڑکی کی موجودگی میں محض اس کے کہیں آس پاس موجود ہونے کے خیال سے ہی ہمیشہ اس کو بڑی سلامتی اور مہربانی اور فراغت کا احساس ہوا تھا۔ یوں کہ جیسے بڑی سخت طوفانی رات میں آپ کسی خوب گرم اور روشن کمرے میں اطمینان سے بیٹھے ہوں اور بند کھڑکیوں کے باہر طوفان کی آوازوں کو دلچسپی سے سن رہے ہوں اور محظوظ ہو رہے ہوں۔ کچھ اس طرح کا احساس اس کو ہمیشہ ہوا تھا اس لئے کہ اس لڑکی میں اس کے لئے کوئی کشش نہ تھی، وہ کشش کہ جو دنیا کی ساری اور لڑکیوں میں دور و نزدیک جان انجان اور نام بے نام کی اکا ایک لڑکی میں تھی، جس کے ہونے سے کہ اس نے ایک عمر تک ایسے ایسے لاحاصل دکھ اٹھائے تھے کہ اکا ایک لڑکی سے ایک عمر تک وہ بیک وقت خوفزدہ اور مسحور رہا تھا اور ایک وقت آیا تھا کہ وہ کہیں کی بھی ہو کس نام کی اور کس کام کی بھی ہو لڑکی ہو وہ اس کی محفل میں صرف اس کی موجودگی میں ایک ہنس مکھ لاابالی نوجوان سے پلک جھپکنے میں ایک ڈرا ہوا بے اعتماد بچہ بن جایا کرتا تھا۔ کہ جس چیز میں بھی انسانی وجود کا دخل ہو وہ انسان کو اسی طور بلوغت کی ہر سطح سے نیچے کھینچ لاتی ہے ۔ کہ جس کو چھپانے کی خاطر اس کو مستقل ایک عظیم کشمکش سے دوچار رہنا پڑتا تھا جس کے نتیجے کے طور پر ایک وقت آیا تھا کہ اسے اپنی شخصیت کو ثابت و سالم رکھنا محال ہو گیا تھا اور وہ خدا کی پیدا کی ہوئی ساری مخلوق میں سب سے خوشنما اور عمیق اور مکمل خلق ۔ جوان عورت ۔ سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ اس کو وہ سارا وقت یاد تھا۔ جب تک کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تب تک اس کو یہ بھی یاد تھا کہ گھوم پھر کر ایک جگہ جہاں امن و سلامتی اور مہربانی

کا احساس ہوتا تھا اور ایک جگہ جہاں وہ اپنی عمر و نظر کی بلوغت اور کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل کر سکتا تھا اور مکمل اور بے خطر آزادی النفس کے ساتھ رہ سکتا تھا اس لڑکی کے آس پاس تھی کہ اس میں ایسی کوئی کشش تھی۔

وہ اس کو ایسی اچھی طرح سے جانتا تھا۔

"آج تم ہر ایک سے لڑنے پر تلی ہوئی ہو" اس نے کہا۔

"نہیں۔ صرف آپ سے"

"تم محمود سے بھی لڑ کر آئی ہو"

"محمود میرا شوہر ہے"

"پھر؟"

"وہ میرا ذاتی معاملہ ہے"

"میں تمھارے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہوں؟"

"نہیں"

"کیا؟"

"آپ میرے ذاتی معاملے میں شامل نہیں ہیں"

"ایس"

"ہاں"

"اوہ ـ" وہ غصہ دباتے ہوئے بولا "کیا ہی اچھا تھا اگر یہ سچ ہوتا"

"آپ میری کسی چیز میں شامل نہیں ہیں"

"تو پھر مجھ پہ ایک مہربانی کرو۔ اس بات کا سب لوگوں میں اعلان کر دو"

"کیوں؟"

"میں تمھارا روز کا جھگڑا چکاتے چکاتے تنگ آگیا ہوں"

"جھگڑے میں آپ خود پڑے ہیں"

"کیسے؟"

"آپ نے میری شادی کرائی ہے۔"

"تو ہیں ۔ تو میں اس کا قصوروار ہوں؟"

"میں تسلیم کروں نہ کروں آپ اس میں شامل ہیں بہرحال۔"

"تو میں اس کا قصوروار ہوں؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

جب تھوڑے سے وقت میں بہت سی غیر متوقع باتیں ایک ساتھ واقع ہو جائیں تو انسانی ذہن کا وہ چمچماتا ہوا تیز حصہ جو اس کے صدمے کو درج کرتا ہے کچھ دیر کے لئے ہی سہی، ایک دم کند ہو جاتا ہے جو کہ عین اس وقت اس کے ساتھ ہوا جب اس نے ساری باتوں کو چھوڑ کر دفعتاً فرش پر پھیلے ہوئے دودھ اور چائے اور شکر کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ بڑی آسانی سے اٹھ کر چائے کے برتن اکٹھا کرتے اور انھیں طشتری میں رکھتے اور اوندھی میز کو کھڑا کرتے ہوئے اس کے اوپر گیلے قالین اور ٹوٹی ہوئی پیالی کا پورا المیہ اپنی تمام تر شدت اور مضحکہ خیزی کے ساتھ واضح ہو گیا، اس لئے کہ یہ لڑکی جو اس کے سامنے ایسی ٹھوس خودمختاری کے ساتھ بیٹھی تھی اور جو چاہتی تھی کر رہی تھی، چاہتی تھی کہہ رہی تھی، ہمیشہ سے ۔ اور ہمیشہ میں قریب پچیس سال کا عرصہ آتا تھا ۔ اسے خالی چینی کی پیالی کی طرح نازک اور بے زبان اور ادھوری اور غیر محفوظ معلوم ہوئی تھی اور حقیقت میں تھی بھی ایسی کیونکہ وہ اس کو ایک عرصہ سے جانتا تھا اور ایک عمر میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جو کسی ایک شخص کو جاننے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لڑکپن کا زمانہ جب آپ ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور اتنا طول طویل کھیلتے ہیں کہ دیر سویر کی خبر نہیں رہتی اور دور دراز ایسی ایسی جگہوں پر کھیلتے ہیں جو کسی کے علم میں نہیں ہوتیں اور ایسا ایسا گہرا کھیلتے ہیں کہ ایک دوسرے کی بو باس کے واقف ہو جاتے ہیں اور آنے والے سارے زمانوں پر اس زمانے کی ایسی چھاپ لگ جاتی ہے کہ پھر عمر میں جب بھی کبھی کسی ایسے وقت یا ایسی جگہ میں سے اتفاقیہ آپ کا گزر ہوتا ہے جو ان جگہوں سے ان چہروں سے ان وقتوں سے ان ناموں سے بلکہ ان گمشدہ آوازوں تک سے اور کبھی کبھی تو محض کسی بازو کسی ہاتھ کے اس واحد، نامکمل اشارے اور کسی آنکھ کی اس مخصوص لمحاتی چمک سے ہی ذرہ بھر کا بھی میل کھاتی ہے جن سے آپ کی آشنائی رہ چکی ہوتی ہے تو ذہن چشم زدن میں سارا فاصلہ طے کر کے وہاں جا پہنچتا ہے اور لوٹ بھی آتا ہے اور یوں ایک لمحے میں ایک عمر کا احاطہ

کر لیتا ہے صرف اس لئے کہ آپ اس زمانے کو اور اس سے متعلق ہر چیز کو ہر بات کو اور ہر شخص کو اتنی اچھی طرح سے جانتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کو اس وقت سے جانتا تھا۔

"میں تنگ آچکا ہوں" اس نے کہا۔

"کس بات سے؟"

"تمھارے جھگڑوں سے"

"آپ سے کس نے کہا تھا؟"

"کیا؟"

"کہ جھگڑے میں پڑیے"

"مجھ پہ لازم آتا تھا"

"کیسے؟"

"ایسے کہ میں ــ کہ میں تمھارا ــ ہنہ ــ ہنک!"

"کہیے کہیے۔ آپ میرے کیا؟"

"کہ میں تمھارے گھر کا ایک فرد ہوں۔ تقریباً"

"میرے گھر کے فرد اور بھی ہیں"

"اور اس لئے بھی کہ میں تمھاری شادی کرانے کا ذمہ دار ہوں"

"آپ سے کس نے کہا تھا؟"

"ہنک ــ لاحول ولاقوت ــ تمھارے گھر والوں نے کہا تھا بی بی"

"میں نے تو نہیں کہا تھا نا؟"

"تم نے ــ ارر ــ تمھیں تو پتا ہی تھا"

"اور نہ مجھ سے آپ نے پوچھا ہی تھا"

"اس سے بھلا ــ"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ ٹھیک ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ٹھیک ہے"

"پھر؟" وہ مری ہوئی آواز میں بولا

"پھر آپ میرے کسی جھگڑے سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ ٹھیک ہے"

اور عمر بھر کے علم کی بنا پر وہ کہہ سکتا تھا کہ اس لڑکی نے آج تک کسی موقع پر کبھی شخصی طور پر، ذاتی سطح پر بات تک کرنے نہ دی تھی۔ یہ اور بھی حیرت کی بات تھی۔

"آپ آپ آپ" اس نے کہا، "یہ کیا گردان لگا رکھی ہے تم نے۔ سیدھی طرح سے بات کرو"

"آپ آپ آپ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ"

"اووووو" اس نے حلق سے گہری کربناک بیزار کن آواز پیدا کی۔

"اچھا تم" وہ مسکرائی، "تم ٹھیک ہے؟"

"اووو"

یہ حیرت کی بات تھی اس لئے کہ اس کو وہ وقت یاد تھا جب وہ عمر کے اس دور میں سے گزر رہا تھا جب وہ ہر کسی سمت کا احساس کھو چکا تھا اور شاموں کو غیر آباد سڑکوں پر گھنٹوں اکیلا اکیلا پھرتے رہنے کے بعد ان کے گھر آکر کرسی پر ڈھیر ہو جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی جب ہمسائیگی کی ۔ دلوں کی ہمسائیگی کی ۔ خواہش شدید ہو جاتی تھی اور وہ گھر میں اکیلی ہوا کرتی تھی تو وہ سر اٹھا کر کوئی نہ کوئی بات کیا کرتا تھا: "ثروت۔ تم کو پتا ہے کہ میں کہاں کہاں سے پھر کر آیا ہوں" یا "بی بی۔ یہاں آکے مجھ سے باتیں کرو۔ میں تھک گیا ہوں" یا "تم ہر وقت کام میں کیوں لگی رہتی ہو باؤلی سی" اور وہ اپنی آہستہ رو، غیر جانب دار مصروفیت میں لگی، اپنے غیر جانب دار، لاتعلق لہجے میں اپنی کسی حرکت سے، کسی بات سے فوراً اس کو اسی غیر شخصی سطح پر واپس لے آتی تھی جس پر کہ ان کے تعلقات قائم تھے۔ پھر اس کے بعد وہ وقت جب اس کی شادی ہوئی تھی اور اس نے آکر پوچھا تھا "ثروت، بلقیس تم کو کیسی لگی؟" تو جواب میں وہ بولی تھی "بڑی اچھی لگی بھابی بہت اچھی لگی۔" مگر ایسے لہجے میں بولی تھی جو اس کو آج تک یاد تھا اور جسے محسوس کر کے اس کا لہو سرد پڑ گیا تھا، اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی حسد یا کوئی رنج تھا، اس لئے کہ اس میں مشین کی سی لاتعلقی اور یکسانیت تھی جس کا وہ اس وقت متوقع نہیں تھا۔

پھر اس کے بعد وہ وقت جب اس کی بیوی نے وفات پائی تھی اور وہ کہ جس کے لئے اپنی ماں کے بعد دنیا بھر میں صرف بیوی ایک ایسا بشر تھی جس کے کسی حد تک وہ قریب آسکا تھا اس حادثے میں یکسر کھو کر رہ گیا تھا اور

ایک روز اس کے پاس بیٹھا بیٹھا بول اٹھا تھا۔ "بی بی۔ کچھ تمہی بتاؤ"۔ اور اس نے جواب میں کہا تھا "صبر کرو"۔ اور وہ ان دو لفظوں کو جو ساری دنیا نے اس کے سامنے دہرائے تھے اور جس میں ساری دنیا کی سرد مہری اور لاتعلقی بھری ہوئی تھی آخر اس کی زبان سے بھی نکلتے سن کر سخت رنجیدہ ہو گیا تھا۔

یہ وقت اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کے بہت سے وقت۔ درحقیقت اس کو بہت سے زمانے یاد تھے جن میں گو کہ وہ برابر کی شریک تھی مگر شخصی سطح پر کسی ایک میں بھی درست نہ بیٹھتی تھی، قریب نہ آتی تھی۔

"تم سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی بی بی"۔ اس نے کہا۔

"بی بی۔ بی بی"۔ وہ پھٹ پڑی۔ "بی بی"۔

"ایں؟"

"جیسے میں بھیڑ ہوں یا بکری ہوں یا کیا ہوں۔ جس کا کوئی نام نہیں کوئی کام نہیں۔ جس کا۔۔۔"

"ثروت!"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ ثروت۔ یہ میرا نام ہے"۔

"ثروت!!"

"تم نے عمر بھر مجھ کو کوئی نام نہیں دیا کبھی بھی۔ میری شخصیت کو میرے وجود تک کو تسلیم نہیں کیا، مجھے کچھ بھی نہیں سمجھا"۔

"کچھ — بھی نہیں؟" اس نے دہرایا۔

"میرے نام کو تم جانتے رہے ہو پکارتے بھی رہے ہو اور برابر بے خبر رہے ہو۔ برابر"۔

"کس سے بے خبر رہا ہوں؟"

"مجھ سے —" وہ چیخی — "مجھ سے!"

"میں کچھ نہیں سمجھا ثروت"۔

"تم نے کبھی نہیں جانا کہ میں بھی کوئی ہوں، تمہاری طرح، دوسروں کی طرح، ایک انسان۔ اور دیکھتی بھالتی ہوں، سوچتی ہوں محسوس کرتی ہوں، کچھ چاہتی ہوں، کوئی وجود رکھتی ہوں، کوئی شخصیت الگ، مخصوص، جیسے ہر کوئی رکھتا ہے، جیسے تم رکھتے ہو۔ تم نے کبھی نہیں جانا"۔

"مگر ثروت ۔ میں ہمیشہ تمھارا۔"

"تم ہمیشہ میرا خیال رکھتے ہو؟ ٹھیک ہے۔ ہمیشہ میرے آس پاس رہے ہو؟ ٹھیک ہے۔ مجھ سے اتنے مانوس اتنا قریب رہے ہو؟ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر کتنا لاتعلق رہے ہو۔"

"سراسر غلط ہے۔ سراسر۔ برعکس اس کے ۔۔ اس کے برعکس تم لاتعلق رہی ہو۔"

"میری بدقسمتی یہ ہے نعیم کہ تم مجھے اس وقت سے جانتے ہو جب میں ایک کرتہ پہن کر ننگے پاؤں گلیوں میں بھاگا کرتی تھی اور تم مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا کرتے تھے اور مجھ سے اتنے مانوس، اتنے غافل تھے اور ہمیشہ رہے ہو اور میں اس کا بدلہ لینے کے لئے عمر بھر لاتعلق بنی رہی ہوں مگر ایک روز ۔۔" وہ رک گئی۔

"ایک روز؟"

"ایک نہ ایک روز پتا چلتا ہے کہ ہم کسی سے بدلہ نہیں لیتے۔ صرف اپنے آپ سے لیتے ہیں۔"

"تمھاری اپنی غلطی تھی۔"

"غلطی نہیں تھی مجبوری تھی۔ عورت کی انا اس کے سر سے کہیں بلند ہوتی ہے۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے کہا۔ "کہ بچپن کی باتوں کا، بچپن کی دوستی کا بدلہ لینے کیلئے تم۔"

"بچپن کی دشمنی کا ہم کبھی بدلہ نہیں لیتے پاگل آدمی۔" مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی کڑوی تھی۔" دشمنی تو نادانی ہوتی ہے۔ دوستی ظلم ہوتا ہے۔ بدلہ ہم صرف بچپن کی دوستی کا لیتے ہیں میری طرف دیکھو۔ اوپر سے نیچے تک دیکھو۔ تم نے آج تک نظر بھر کے میری طرف نہیں دیکھا۔ میں ایک مکمل عورت ہوں، ایک مکمل اکائی ہوں، ایک شخصیت ہوں۔ آج سے پہلے تمھیں کبھی اس کا خیال آیا تھا؟"

"میں کبھی تم سے غافل نہیں رہا۔"

"درست ہے۔ تم ہمیشہ میرے بارے میں بڑے باخبر رہے ہو۔ اسی طرح جیسے اس کرسی یا اس میز یا اس کھجور کے پیڑ یا میاؤں بلی کے بارے میں رہے ہو۔ کبھی تم نے آج تک مجھ کو وہ کچھ سمجھا ہے جو کہ میں دراصل ہوں؟"

"میں نے ہمیشہ تم کو ثروت سمجھا ہے اور جاوید کی بہن اور ایک نہایت عزیز ہستی اور ایک بہت پرانی دوست اور ایک معقول شریف لڑکی سمجھا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ سمجھنے کی میں جانتا ہوں کہ کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔"

"معقول شریف لڑکی معقول شریف لڑکی" وہ ہوا میں ہاتھ پھینک کر بولی، "تمھیں پتا ہے اس کا مطلب؟ جہاں ہم رہتے ہیں وہاں معقول شریف لڑکی اللہ میاں کی گائے ہوتی ہے۔ جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی کوئی خیالات نہیں ہوتے، جس سے کسی نظریے کی توقع نہیں رکھی جاتی۔ جو حیوان مال ہوتی ہے جو محض فرض کرلی جاتی ہے محض قبول کرلی جاتی ہے اور نظر انداز کر دی جاتی ہے اور مستقل کی جاتی ہے مستقل۔"

"تم خواہ مخواہ مبالغے سے کام لے رہی ہو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔"

"جب عمر بھر کی پس و پیش کے بعد فیصلے کی قوت ملتی ہے تو دل ٹھنڈا نہیں رہتا اور نہ سوچ رہتی ہے۔ تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا خراب سلوک کرتے ہو۔"

"ہم لوگ؟"

"ہم عورتیں۔" وہ بولی، "ہم عورتیں۔"

"اوہ ثروت۔" اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، "اس میں میرا کیا قصور؟"

"تمھارا قصور؟ تمھارا؟" وہ بولی، "محمود تمھارا دوست تھا اور تم نے میری شادی ٹھیرائی تھی۔ تم مجھ سے پوچھ نہیں سکتے تھے؟"

"پوچھنے کے لئے تمھارے گھر والے جو موجود تھے۔"

"گھر والے!" وہ بولی، "گھر والے کیا ہیں؟ محض گھر والے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"گھر والے اہم نہیں تھے۔ تم تھے۔"

"کیسے؟"

"میرے لئے۔"

"ثروت۔" یوں جیسے وہ زندگی میں پہلی بار چونکا ہو، "میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔"

پھر وہ اس کی خاموش، بیباک نظروں سے اپنا جواب حاصل کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ندامت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگی۔

"نعیم عورتوں میں بڑا صبر ہوتا ہے اور بڑی شرم ہوتی ہے۔ آنی کہ میں ابھی تک آنکھ ملا کر تم سے بات نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اب وہ وقت آیا ہے۔ وہ وقت کہ جب آدمی عورت ہو کہ مرد اتنا کچھ بھگت چکا ہوتا ہے کہ نہ شرم رہتی ہے نہ صبر۔ میں تیس برس کی ہو چکی ہوں اور میں نے زندگی کی ساری ڈھکی چھپی شکلوں کو دیکھ لیا ہے اور اب کھل کر بات کر سکتی ہوں۔" وہ پلٹی۔ "مجھ پر رحم کرو۔"

"ثروت!"

"میں نے سمجھا تھا کہ میں بھول جاؤں گی، کہ دنیا بہت بڑی ہے اور اس میں جسم کے مسئلے ہیں اور پیٹ کے اور روز بروز کی زندگی کے جو بہت اہم ہیں اور آخر فتح پا جائیں گے۔ عورت اپنا سر بلند رکھنے کے لئے آخر دم تک اپنے آپ کو دھوکا دے سکتی ہے، یہ بدبخت بے سمجھ سر، یہ گلا سڑا فضول، نکما لاحاصل۔"

"ثروت" اس نے کہا، "محمود۔"

"خدا کے لئے یہ مت سمجھو نعیم کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ وہ بہت بڑا انسان ہے اور اس نے مجھے کبھی دکھ نہیں دیا اور میں اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اس کو خوش رکھنا چاہتی ہوں اور اس کی خاطر۔ اپنی خاطر نہیں اور نہ تمھاری خاطر، صرف اس کی خاطر میں نے اپنا سر تمھارے آگے جھکایا ہے۔"

وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا، پھر بیٹھ گیا۔

وہ کمرے میں پھرتی رہی۔ "پانچ سال کا عرصہ گزر گیا ہے اور میں آج تک اس سے کھل کر بات نہیں کر سکی ہوں۔ نعیم یقین جانو کہ میں نے کوشش کی ہے، ہر روز، ہر رات میں پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ۔"

"خدا کے لئے چپ رہو۔"

"مگر تنہا رہی ہوں۔ ہر روز ہر رات ہر ہر لمحے مجھ کو احساس رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی وقت، کوئی نہ کوئی شے بہرحال۔ کھوئی گئی ہے، چھوٹ گئی ہے، ضایع ہو گئی ہے اور اس کی کھٹک میرے دل میں برقرار رہی ہے ہمیشہ ہمیشہ۔ وہ شے جس کے بغیر ایک بیوی کبھی مکمل خود سپردگی کے ساتھ اپنے خاوند سے تعلق قائم نہیں کر سکتی، وہ جس کے چھوٹ جانے سے انسانوں کے درمیان دیانت داری ختم ہو جاتی ہے، پھر ایک روز۔ ایک روز جب سانس بھی سینے میں رکنے لگتی ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ یہ سب اس قدر فضول ہے فضول۔ فضول۔ لاحاصل۔"

"مجھے افسوس ہے ثروت مگر۔"

"میرا دل تو کیا۔" وہ بولی، "آج تک اس کے ساتھ میرا جسم بھی نہیں کھل سکا۔"

"ثروت بیگم۔" اس نے کہا، "زندگی کی گاڑی کو اب موڑا تو نہیں جا سکتا۔"

"مگر اس دکھ کو تو ختم کیا جا سکتا ہے۔" وہ بولی، "اس تنہائی کو!"

"کیسے؟"

"نعیم۔" وہ بولی، "میں اس کو چھوڑ نہیں سکتی۔ میں دیانت داری سے اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، سانس لینا چاہتی ہوں، اور مدد مانگنے تمھارے پاس آئی ہوں۔"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"مجھے آزاد کر دو اس احساس، اس احساسِ زیاں سے، اس ادھورے پن کے احساس سے جو میرے اور اس کے درمیان حائل ہے مجھے نجات دلا دو۔"

"مگر کیسے؟" وہ چیخا، "کیسے؟"

پھر اس کی خاموش بے باک نظروں اور ہوا میں پھیلے ہوئے بولتے ہوئے، فریاد کرتے ہوئے مایوس، بے شرم ہاتھوں سے اپنا جواب پا کر وہ سن رہ گیا۔

"تم نے عمر بھر مجھ پر ظلم کیا ہے۔" وہ بولی، "اب تم میرے لئے، میرے خاوند کے لئے، میرے گھر کی سلامتی کے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتے؟"

"ثروت!"

"میں ختم ہو رہی ہوں نعیم۔ رحم کرو۔"

"ثروت!!"

"رحم کرو۔ رحم کرو نعیم۔ خدا کے لئے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹھا اس کو ہاتھ پھیلائے فریاد کرتے اور فرش پر لوٹتے ہوئے تکتا رہا۔

پھر جب رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تو اس نے سوچا کہ محبت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں کہ ایک وہ

ہے جو ہمیں نادار کرتی ہے۔

مگر محبت آخر محبت ہے جو کچھ بھی اور کیسی بھی ہو انسان کو اپنے آپ سے الگ کرنے، اوپر اٹھانے، کہیں نہ کہیں پہنچانے پر حاوی ہے۔ بہر حال۔ یوں کہ جب رات ابھی شروع ہی ہوئی تھی تو اس نے صرف ایک سوال کیا تھا :
"تم ہمیشہ ننگے بدن سوتی ہو؟" اور جواب میں اس نے آہستہ سے کہا تھا: "شی"۔ یوں جیسے ماتمی مجلسوں یا مقدس مزاروں پر ہر دم سوال کرتے رہنے والے بچّوں کو چپ کرایا جاتا ہے اور یوں یہ وہ واحد کلمہ ثابت ہوا تھا جو رات بھر میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اور اس نے ذرا حیرت سے سوچا تھا کہ عورت کی بھی کتنی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہ ایک یہ تھی جو آج تک اس کے لئے تقریباً بے جنس اور بالکل بے کشش رہی تھی درحقیقت اس بلا کی جاندار اور روشن تھی، ایسی کہ پل کے پل میں اس کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی کہ عورت تھی اور جب عورت اور محبت کا میل ہوتا ہے تو ایک کرشمے کا ظہور ہوتا ہے جس کے واسطے سے، بلندی کا ہو کہ پستی کا ہو، زندگی کا ایک تجربہ ہوتا ہے جو عظیم اور معرکہ خیز ہوتا ہے، اس لحاظ سے کہ آدمی کو اپنے آپ سے الگ ہو کر، اوپر اٹھ کر، زندگی کی بلند سے بلند اور پست سے پست شے کو، ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، ایک سطح پر، ایک نظر میں دیکھنے اور اس کے خود میں جذب کرنے اور پھر خود کو کائنات میں کھونے اور ساری جاندار اور بے جان چیزوں کے ساتھ ایک ہونے ــــ ایک لمحے کے لئے ہی سہی ــــ ایک ہونے اور اپنے آپ کو عظیم اور قوی اور لافانی ذات واحد خیال کرنے کی اہلیت بخشتا ہے۔ اس بات کا اس کو علم ہوا تھا۔ وہ، جو سمجھے ہوئے تھا کہ اتنی عمر میں پیدائش سے لے کر شادی اور شادی سے لے کر موت تک زندگی کی ساری تاریخ اور ساری اونچ نیچ اور سارے دکھ اور ساری راحت سے آشنا ہو چکا ہے اور اب کسی بات اور کسی چیز سے بھی نہیں چونک سکتا یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا کہ وہ لمحہ، وہ ایک لمحہ جو اس کے سنِ بلوغت کو پہنچنے کے بعد ہزاروں بار اس پر آیا تھا اور کبھی پریشانی اور کبھی پشیمانی اور کبھی محض لذت دے کر گزر گیا تھا۔ جب اس میں محبت شامل ہوتی ہے اور عورت کی ساری ہستی اور اس کے بدن کی ساری رضامندی شامل ہوتی ہے تو ناداری کا وہ عظیم لمحہ بھی آدمی کو قوت اور اختیار اور انبساط اور لافانیت کے اس نشے اور فنافی الذات کی ان بلند گہرائیوں تک پہنچانے پر قدرت رکھتا ہے جہاں پہنچ کر وہ سرور اور طاقت کی آگ میں پگھل جاتا ہے اور پھیل کر ساری کائنات کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بس وہ ہی وہ ہے، اور کچھ نہیں ہے اور کچھ بھی نہیں ہے ــــ اس لئے کہ جب بدن بدن سے خطاب کرتا ہے اور ہار جاتا ہے تو لہو لہو سے ہم کلام

ہوتا ہے اور جب لہو سرد پڑ جاتا ہے تو محبت جب بھی رہتی ہے، اچھے وقت کی یاد کی طرح جو دراصل اچھے وقت کی نسبت، جس کے واسطے سے کہ وہ ہوتی ہے، زیادہ خوش کن اور پائیدار ہوتی ہے لیکن جس کے وجود کے بغیر کہ جو وجود میں نہیں آسکتی محبت بھی جب بدن بدن کا مخاطبہ انجام پاتا ہے اور لہو لہو سے مکالمہ ترک کرتا ہے تو باوجود اور بدستور رہتی ہے مگر اپنا وجود بہر حال بدن بدن کے اس رشتے سے حاصل کرتی ہے جو لہو کی گرمی پر قائم ہوتا ہے اور جس کے واسطے سے باقی سارے رشتے ہوتے ہیں، کہ پھول جو اپنی مرطوب حدت پر قائم ہوتا ہے سب سے فی الواقع وجود ہوتا ہے اور گو کہ اس کی خوشبو لطیف تر اور حسین تر اور اعلیٰ تر ہوتی ہے اور جسے میں خانہ بدوش کی سی آزادی اور خود مختاری اور خود کامی اور ہرن کی سی وحشت اور رفتار اور تیز لے کر پیدا ہوتی ہے پھول کے بدن کے واسطے کے سوا کوئی واسطہ دنیا میں کسی سے اور کوئی وجود دنیا میں کبھی نہیں رکھتی بہر حال۔ اس بات کا اس کو علم ہوا تھا۔

مگر اب وہ لمحہ گزر چکا تھا اور اب وہ اپنا فاتح اور پر سکون جسم بستر پر پھیلائے چاروں شانے چت لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے پر وہ ایک چھچھلتی ہوئی بے دھیان نظر اس پر ڈال لیتا تھا جو اب اس سے منہ موڑ کر لیٹ گئی تھی اور دیوار کو تکے جا رہی تھی اور اس کا لمبا تاریک بدن جس کو ڈھانپنے کی بھی اس نے تکلیف نہ کی تھی مسلسل جھر جھرا رہا تھا اور وہ ہلکی ہلکی گہری اور ملفوف اور نامانوس آوازوں میں ہنسے جا رہی تھی، یا شاید روئے جا رہی تھی، اور اس نے کئی بار اٹھ کر دیکھنا چاہا کہ یہ ہنسی کی آواز تھی کہ نالہ تھا مگر کوشش کے باوجود ایک بازو، ایک انگلی تک کو نہ ہلا سکا اور اسی طرح اپنا فاتح پر سکون جسم بستر پر پھیلائے دل میں موت لئے پڑا رہا۔

اور یوں تیس سال کی عمر پانے اور اس کے سرد و گرم سے گزرنے کے بعد اس کو — وہ جو دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھی — آخر اس بات کی خبر ہوئی کہ دنیا میں آدمی اپنی قسمت کا لکھا یا اپنے کرموں کا پھل نہیں صرف اپنی خواہشوں کی سزا پاتا ہے، کہ جو پوری ہو جاتی ہیں وہ بھی اور جو حسرتیں بن جاتی ہیں وہ بھی کہیں کچھ نہیں دیتیں کبھی بھی صرف نادار کرتی ہیں، کہ اچھی اور بری دونوں کو ہم ایک ساتھ بھگتتے ہیں، کہ ایک بار دلوں کی ہمسائیگی ختم ہوتی ہے تو پھر جسم کی قربانی سے نہیں لوٹتی، کہ اسی لئے پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ آدمی جب بھی جہاں بھی اور جیسے بھی چاہے اپنے دکھ کو ختم کر سکتا ہے کہ یہ اس کے اختیار میں ہے، کہ نتیجتاً وہ غریب ہو جاتا

ہے یا امیر، یہ بھی اس کے اختیار میں ہے۔ شاید وہ رو رہی تھی، آخر کار۔

صبح وہ ناشتے کی میز پر اس کے سامنے بیٹھا رہا جب تک کہ اس کی ماں نے آکر برتن نہ اٹھالئے۔

"ثروت" پھر اس نے کہا۔

"چلو چلیں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ثروت"

"چلو چلیں" وہ بولی، "اٹھو"

اس کی ماں کو سلام کر کے اور اسے ساتھ لے کر وہ باہر نکل آیا۔

"جاوید کا خط آیا ہے" وہ اسے بتانے لگی "اگلے ہفتے آرہا ہے۔ اب کے وہ اماں کو ساتھ لے جائے گا۔ پھر گھر اکیلا رہ جائے گا، شاید بند کر دیا جائے۔ یا کرائے پہ دے دیا جائے۔ آج دھوپ کتنی سرد ہے"

"ثروت"

"وہ دیکھو دو لڑکیاں گر پڑیں۔ نجانے دو دو کر کے سائیکل پر کیوں چڑھتی ہیں"

"ثروت!"

"شی۔"

"ثروت!"

"نہیں نعیم" وہ بے حد تھکے ہوئے لہجے میں بولی، "خدا کے لئے چپ رہو"

وہ چپ رہا، مگر برابر اس کو دیکھے گیا۔

"پیدل چلیں یا بس پہ؟" وہ بولی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"پیدل چلتے ہیں۔ فاصلہ ہی کتنا ہے"

"ہاں۔ فاصلہ کتنا ہے"

"بے سود!"

"ہونہہ؟"

"سب بے سود تھا۔ بے سود۔"

"ایں؟"

"لاحاصل۔ فضول۔ فضول۔"

"نہیں۔۔۔"

"مجھے علم تھا۔"

"ثروت۔ میں اب تمھارے بغیر۔۔۔"

"تم لوگ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو۔" وہ انتہائی بددلی سے بولی۔ "میرا گھر آگیا ہے۔"

وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ "چلو۔"

"نہیں۔ تم اب جاؤ۔"

"کہاں؟"

"جاؤ۔"

"مگر۔"

"اب کبھی یہاں مت آنا۔"

"کیوں؟"

"میں تم سے کبھی ملنا نہیں چاہتی۔"

"ثروت!!"

اندر اس کا خاوند صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بے دلی سے مسکرا کر گھر کے اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی اور اس کا خاوند پاس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا تو وہ کوشش کر کے مسکرائی اور بولی۔ "آج دفتر نہیں گئے؟"

رفیق حسین (مرحوم)

بیرو

جوگی کی گرفتاری کے بعد سے بیرو کا مزاج اور بھی زیادہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ قصبہ کے لڑکوں نے اسے لاوارث سمجھ کر چھیڑنا شروع کیا تو وہ آتے جاتے ہر ایک انسان پر حملہ کرنے لگا۔ جانبین سے رنجشیں اس قدر بڑھیں کہ قصبہ کے لوگوں نے اینٹیں پتھر مار کر اسے جوگی کی منڈیا بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پژمردہ دل بیرو منڈیا کو حسرت سے دیکھتا ہوا ریلوے لائن کے پار اتر کر جنگل کے کنارے نہر کے پرانے بھٹے پر چلا گیا، جہاں اس نے گاؤں کی بھینسوں کو مار مار کر نکالنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے ادھر سے راستہ چلنا بند کر دیا۔ کٹھیمہ کی بستی بھر میں اطلاع ہو گئی کہ جوگی کا مرکھنا نیل گائے بھٹہ پر ہے۔ ادھر کوئی نہ جائے۔ بیرو نے بھی بھٹہ کی تنہائی کو غنیمت سمجھا۔ اس کو انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گاؤں کے جانوروں کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے خیال میں وہ اور اس کا جوگی (جس نے کہ اسے پالا تھا) دونوں یکہ و تنہا ایک دوسرے سے محبت کرنے کو پیدا ہوئے تھے۔ ان دونوں کا ثانی کوئی نہ تھا۔ نہ جوگی ایسا نیم برہنہ بڑھے ہوئے بالوں والا کوئی دوسرا انسان تھا۔ نہ ایسا بھاری قد آور۔ سیاہ کوٹ، سفید مفلر، خوبصورت چونچ دار ڈاڑھی اور نوکیلے چمکتے سینگ والا دوسرا جانور ہی پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنی تنہائی کا خیال آیا کرتا تھا۔ لیکن جوگی کی صحبت میں دل بہل جاتا تھا۔ جوگی اسے اپنے اکتارے پر گانے اور بھجن سنایا کرتا تھا۔ نمک ملوان بھیگے ہوئے چنے کھلاتا تھا۔ اس کی گردن کھجاتا تھا۔ اب جوگی بھی دفعتاً جدا ہو گیا۔ نہ معلوم کہاں گیا۔ جوگی کی جدائی اور اپنی تنہائی سے بیرو افسردہ تھا۔

شروع جاڑے کا موسم، شام ہو رہی تھی۔ بھٹے پہ ایک گڑھے کے کنارے جہاں اس نے

اپنی بیٹھک بنائی تھی۔ بیرو کھڑا ہوا کبھی پانی میں اپنے عکس کو دیکھتا تھا اور کبھی سر اٹھا کر ریلوے لائن کے پار شام کے دھوئیں سے دھندلی کھٹیمہ کی بستی اور اسٹیشن کو دیکھتا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں طرف سے سریلے گھنٹے بجاتے ہوئے گائیں اور بھینسوں کے ریوڑ گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ آسمان پر ایک دوسرے کو آواز دیتے ہوئے طوطوں اور کوؤں کے جھنڈ بسیرا لینے جنگل کی جانب اڑ رہے تھے۔ اور یہ پانی میں اپنے شاندار عکس کو دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ اس کو افسوس تھا کہ یہ دنیا میں اکیلا ہی پیدا ہوا ہے۔

اس رنج میں بیرو اکیلا وہاں کھڑا تھا۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر جنگل تھا جہاں بالکل خاموشی تھی۔ بہت دور سامنے کھٹیمہ کی بستی سے ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کو اپنی پشت پر ہلکی سی آہٹ معلوم ہوئی۔ اب جو گھوم کر دیکھتا ہے تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بالکل اسی کا ہم جنس ایک نیل گائے جنگل سے دو گز باہر کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ ویسا ہی سفید سینہ، سیاہ پیٹھ، ویسی ہی داڑھی۔ قد بھی قریب قریب اسی کے برابر تھا لیکن گلے میں کوڑیوں کا کنٹھا اور بانسے پر پتلی رسی کی ناتھ نہیں تھی، اور جسم بھی اسی کی طرح بھاری نہ تھا۔ بلکہ سیاہ چھریرے گول چمکتے ہوئے ہاتھ پیر بڑے ہی خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر بیرو کے دل میں ایک عجیب سی گدگدی پیدا ہوئی۔ یہ آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اس نووارد کی طرف بڑھا۔ نیا نیل گائے بھی پھرتی سے دم کی تھاپی کو دائیں بائیں ہلاتا ہوا ایک ایک قدم اس کی طرف آیا۔ جب بیرو اس کے قریب پہنچا تو اس کے دل میں اس ہم جنس سے سینگ لڑانے کی خواہش از خود پیدا ہونے لگی۔ اس کا مدمقابل بھی اپنے سینگوں کی نوکیں سامنے کئے اور سر کو جھٹکا دیتے ہوئے برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن جب ان دونوں میں چار چھ قدم کا فاصلہ رہ گیا تو جنگل کے نیل گائے کی نظر اس کے کنٹھے پر پڑی وہ فوراً ہی گھوم پڑا اور ایک دم بھاگا۔ جنگل میں گھسا اور غائب ہو گیا۔

بیرو پریشان تھا کہ یہ کیا ہوا۔ یہ آہستہ آہستہ گھنے جنگل تک گیا اور دیر تک تاریک جنگل کو دیکھتا رہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جنگل میں گھس کر اپنے ہم جنس کو ڈھونڈے لیکن وہاں بالکل اندھیرا تھا اور اندھیرے میں چلنے پھرنے کا یہ عادی نہ تھا۔ مجبوراً پھر بیٹھے پر واپس آیا۔ ایک اونچی سی جگہ اطمینان سے بیٹھا اور

سوچ سوچ کر جگالی کرنے لگا۔ وہ بار بار جنگل کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید اس کا ہم جنس پھر آجائے

دوسرے دن صبح بہت سویرے بیرو جنگل میں گھس کر اپنے ہم جنس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ یہ بہت دور تک سال بنی میں چلا گیا۔ جہاں کہ اونچے قد آور درختوں کے نیچے زیادہ گھاس اور جھاڑیاں نہ تھیں۔ لیکن اب یہ جوں جوں آگے بڑھتا تھا سال کے درخت چھوٹے اور جنگل گھنا ہوتا جاتا تھا۔ اسے اس گھنے جنگل میں چلنے میں بہت دقت ہوئی۔ یہ کھلی ہوئی صاف زمین کا عادی تھا۔ بیلوں اور جھاڑیوں میں اس کے پیر الجھتے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اسے اس طرح پھرنے میں لطف آنے لگا۔ اس کو چلتے چلتے دوپہر ہو گئی، لیکن سوائے چند موروں کے اور کوئی جانور یہاں نظر نہ آیا۔ یہ جوں جوں آگے بڑھتا تھا جنگل گھنا اور دشوار ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ پریشان ہو کر لوٹ پڑا۔ جب یہ جنگل سے باہر نکلا۔ دن چھپ رہا تھا جنگل کے کنارے کانٹوں کی باڑھ سے گھرے ہوئے گیہوں میں یہ گھس گیا۔ ہرے ہرے گیہوں میں یہ چرتا ہوا ایک دفعہ پھر کھیتمہ کی طرف چلا کہ شاید جوگی آگیا ہو۔

راستہ میں کئی آدمیوں نے اس پر ڈھیلے برسائے اور اس نے ان پر حملے کئے۔ جب یہ منڈیا کے پاس پہنچا تو لوگوں نے باقاعدہ لاٹھیوں اور پتھروں سے اس کی تواضع کی۔ جوگی کے ملنے کے بجائے کئی پتھروں کی چوٹیں اسے ملیں۔ ناچار بھٹے پر آگیا۔ اب نہ بھٹے پر اس کا دل لگتا تھا نہ بستی میں گذر! جنگل ہی کی طرف دھیان تھا۔ مگر وہاں بھی کیا تھا۔ بیرو بے حد بدمزاجی اور مردہ دلی سے رہنے لگا۔ روزانہ شام کو اس جگہ کی طرف دیکھتا رہتا تھا جہاں کہ ایک دفعہ اس نے اپنے ہم شکل کو دیکھا تھا۔

ایک دن سویرے بیرو بھٹے سے کچھ دور جنگل کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ لاکھوں زبردست درختوں کے تنے اوپر کی سبز چھت کے اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے۔ ان ہی میں کچھ کھس کھس ہوئی اور رک گئی۔ بیرو نے رک کر بڑے غور سے ان بے شمار ستونوں میں دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ یہ پھر چلنے کو تھا، ایک دفعہ کئی جانوروں نے ایک ہی ساتھ جنبش جو کی تو اب صاف نظر آگئے۔ ان میں سے ایک اس کا ہم شکل سیاہ نر نیل گائے تھا، اور چار چھریرے بدن کی خوبصورت نازک اندام گائیں تھیں جن کو دیکھ کر بیرو کے دل پر بجلی سی کوندی۔ اس کی ہم جنس ماداؤں کا جھوٹا سا گلہ۔ کاش اس دوسرے نر کی بجائے بیرو خود ان کے ساتھ ہوتا۔ آج اس کو معلوم ہو گیا کہ دنیا میں وہ تنہا جوگی کی صحبت کے

واسطے پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کے دل میں ایک جولانی پیدا ہوئی۔ پست خیال امیدوں میں رنج مسرت میں تبدیل ہوگیا۔ یہ فوراً ان کی طرف ڈلکی کی چال میں روانہ ہوا۔ کھیت اور جنگل کے درمیان کانٹوں کی باڑھ کو بغیر دیکھے بھالے چیرتا کچلتا ہوا چلا گیا۔ ادھر ماداؤں نے ایک ایک دو دو قلانچیں بھر کر کچھ پیش قدمی کی۔ لیکن پھر سب کی سب ادھر ہی منہ کر کے ساکت کھڑی ہو گئیں۔ گلّہ کا مالک جنگلی نیل گائے اپنے حرم کی حفاظت کے واسطے سینگ جوڑ کر ماداؤں کے آگے کھڑا ہوگیا۔ بیرو کو بھی قدرت نے یارگوں میں دوڑنے والے خون نے آگاہ کر دیا کہ دونروں کے درمیان فاتح گلّہ کا مالک ہوتا ہے، اور شکست خوردہ اس وقت تک تنہا پھرتا ہے جب تک کہ وہ طاقتور بن کر پھر نہ فتح حاصل کرے۔ یا کسی دوسرے کمزور نر کو شکست دے کر اس کی خوبصورت ملکاؤں پر قبضہ حاصل نہ کرے۔

بیرو کو اپنی طاقت پر ہی ناز نہ تھا۔ وہ گلّہ کو حاصل کرنے کے واسطے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اگر اس وقت اس کے سامنے ہاتھی بھی ہوتا تو وہ اس سے جا بھڑتا اور اپنے خون کی آخری بوند بہائے بغیر پسپائی قبول نہ کرتا۔

لیکن افسوس جیسے ہی وہ اپنے مدِمقابل کے قریب پہنچا ماداؤں کی نظر اس کے گلے کے لٹھے پر پڑی۔ وہ ڈر گئیں — "پی قوں۔ پی قوں" چلا کر وہ بھاگ پڑیں۔ ان کے نر کو بھی ٹھہرنے کی اب کوئی ضرورت نہ رہی۔ جب مستورات ہی اجنبی کو ناپسند کرتی ہیں تو پھر کیسی لڑائی۔ وہ بھی گلّہ کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ پہلے تو بیرو حیران و ششدر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھر وہ بھی ان کے تعاقب میں دوڑا۔

بھاری جسم دوڑنے کا عادی نہیں۔ جنگل گھنا، رہ گیا، ان کی خاک بھی نہ پا سکا، البتہ ان کی بو ملی۔ اسی کے سہارے چلتا رہا۔ اس کے واسطے آج یہ بالکل ہی نئی بات تھی۔ بوئیں طرح طرح کی اس کو ہزاروں روز معلوم ہوا کرتی تھیں لیکن ان پر کبھی اس نے غور ہی نہ کیا تھا۔ آج اس کو معلوم ہوگیا کہ ان کی بھی کتنی اہمیت ہے۔ ماداؤں کی بوؤں میں عجیب مستی تھی۔ ان کے تعاقب میں مسرت تھی۔ یہ اسی طرح بہت دور چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک جلے ہوئے چاندر کے میدان میں نکل آیا۔ یہاں ہوا تیز چل رہی تھی۔ بو بھی منتشر ہو گئی۔ لاچار کھڑا ہوگیا۔ میدان میں کوئی جانور نہ تھا۔ جنگل کے کنارے کنارے شمال کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں کچھ مادین چیتلیں نظر آئیں، بہت کچھ نیل گایوں سے مشابہ تھیں۔ مگر کہاں یہ نیل گائیں۔ کہاں

یہ چیتلیں۔ جونہی بیرو قریب پہنچا یہ بھی اس سے ڈر کر بھاگیں۔

آج تک بیرو اپنی دنیا، اپنے ہم پالے، اپنے ہم جنس حتیٰ کہ اپنی ہستی سے بے خبر انسانوں کی مصنوعی دنیا میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ جہاں کہ اس کی ہستی ایک ناگوار مہمان سے زیادہ نہ تھی، نہ دنیا ہی اسے اپنی سرگرمیوں میں شامل کر سکتی تھی، نہ بیرو خود اس دنیا کی زندگی میں کوئی حصہ لے سکتا تھا۔ زندگی کی جدوجہد یعنی جنگ بقائے حیات، جس میں کہ رات دن ہر نفس مبتلا ہے۔ یہی زندگی کی دلچسپیاں ہیں۔ یہی چشمہ ہائے آب حیات۔ بیرو ان سے بے سروکار۔ از خود آجانے والی غذا سے شکم پُر۔ غموں اور مسرتوں سے بے بہرہ۔ حسرتوں اور امیدوں سے نا آشنا، جستجو اور تعاقب، نفرت اور محبت، غرض یہ کہ تمام جذبات سے ناواقف نیم خوابیدہ حالت میں زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ عقل و حواس گم کردہ ایک بے کیف نشہ اسے گھیرے ہوئے تھا۔ زندگی اس کے لئے مشغلہ نہ تھی۔ مشغلے اس کے واسطے بیکار تھے۔ لیکن اب دفعتاً اس کے آگے زندگی اصلی پر لطف زندگی کا ایک میدان وا ہو گیا تھا۔ اس کو اپنی اصلی دنیا صاف اور کشادہ سامنے نظر آ رہی تھی۔ وہ دنیا جس کے واسطے یہ پیدا ہوا تھا اور جہاں کا پتہ پتہ اس کے واسطے لامحدود مسرتیں لئے ہوئے پیدا ہوا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی اس کے سلب شدہ حواس (خواہ پانچ ہی مان لئے جائیں مگر میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جنگلی جانوروں میں دس سے زیادہ حواس ہوتے ہیں) تیزی سے بیدار ہونے لگے۔ کان خفیف آوازوں پر گھومنے، ناک میلوں کی بو پر تھرتھرانے لگی، پنڈلیاں سامنے کی رکاوٹیں از خود دیکھ دیکھ کر راستہ ڈھونڈنے لگیں۔ آنکھیں رات کی تاریکی چیرنے لگیں۔

ایک ہی ماہ میں بیرو پکا جنگلی نیل گائے ہو گیا۔ مگر افسوس غلامی کا کنٹھا کوڑیوں کی مالا اب بھی اس کے گلے میں ہے۔ البتہ سڑی ہوئی ناتھ ایک ڈالی میں پھنس کر ٹوٹ گئی ہے لیکن اس کنٹھے نے اس کو پریشان کر رکھا ہے۔ جس طرح کہ کھیمہ کی بستی سینگوں کی وجہ سے اس سے بھاگتی ہے، اب اسی طرح جنگل کی بستی کنٹھے کی وجہ سے اس سے بھاگتی ہے، نئے اگتے ہوئے چاندریں چیتلیں، سانبھر، پاڑے اور نیل گائے راتوں کو خاموش پہلو بہ پہلو چرتے ہوئے دیکھتا لیکن جب یہ ان کے پاس جاتا ہے تو سب ایک ایک کر کے ادھر ادھر ٹہل جاتے ہیں۔ دن کی تیز دھوپ میں پتا ورن، بے جلے چاندروں، گھنے کھیریوں اور

کلکوں کے تختوں میں یہ مارا مارا پھرتا ہے۔ ان میں جابجا اطمینان سے بیٹھے جگالی کرتے جانور اسے ملتے ہیں لیکن اس کی صورت دیکھتے ہی دمیں ہلاتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سر جھکا کر گھنی گھاس کی پتلی گلیوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ بیرو اس سرگردانی اور پریشانی میں جنگل کے کئی رینج پار کر چکا ہے۔ کھکرا، لوہیا، سونی، گرکھا، جگبورا، بگھاندیا پار کر کے منڈی کے شمال مغرب میں نیپال کی سرحد پر چاندنی کی پہاڑیوں میں پہنچ گیا ہے۔

چاندنی کی پہاڑیاں فلک بوس ہمالیہ کی پہلی سیڑھیوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ ہے۔ نہ پہاڑوں کی سردی ہے، نہ چیڑ کے درخت ہیں۔ وہی سال کا جنگل، جنوب کی ترائی سے پھیلتا ہوا ڈیڑھ دو ہزار فٹ کی بلند چوٹیوں تک چڑھتا چلا آیا ہے۔ البتہ یہاں آکر یہ ختم ہو جاتا ہے۔ شمال کے اتار پر جو بے انتہا ڈھلوان ہے۔ بڑے بڑے پتھروں اور پھیلی ہوئی چٹانوں میں پہاڑی، سدابہار گھنی جھاڑیاں، پہلے تو خال خال نظر آتی ہیں لیکن جوں جوں وادی میں اترو یہ بتدریج بڑھتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ نیچے پہنچتے پہنچتے اس قدر گھنی ہو جاتی ہیں کہ چاندنی اور نیپال کے گورا پہاڑ کی تنگ گھاٹی میں کالی ندی کو دونوں طرف سے گھیر کر چھپا لیتی ہیں۔

یہاں سبزے کی آرائش میں قدرت نے اپنی تمام فیاضیاں ختم کر دی ہیں۔ پتھروں پر کائی کی طرح سبزہ اگتا ہے۔ اس سبزے کی ہر پتی کرشمۂ قدرت کا ایک نمونہ نظر آتی ہے، کوئی مخملی ہے چاندنی کی طرح چمکتی ہے۔ کوئی چکنی ہے، ریشم کی طرح نرم اور نازک ہے، کسی پر سرخ ٹھپہ ہے، کسی میں سفید دھاریاں ہیں۔ کوئی انتہائی تراش اور کٹاؤں کی پتی ہے۔ لیکن ہیں سب ہری۔ ہر جگہ ہر طرف ہرا ہی ہرا ہے۔ نیچے سبزے کا فرش اوپر جھاڑیاں۔ جھاڑیوں پر بیلیں۔ ہر جگہ طرح طرح کے پھول۔ ہر جگہ طرح طرح کی خوشبوئیں۔ جگہ جگہ مقطر پانی کے شفاف بہت چھوٹے چھوٹے چشمے۔ گنگناتے، دھیمے دھیمے راگ گاتے، پتھروں کو کتراتے، چٹانوں پہ جھلملاتے، دونوں طرف کی ڈھالوں پر سے بڑی بڑی جھاڑیوں کے سائے میں گھومتے گھامتے نیچے اترتے چلے آتے ہیں اور کالی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کالی متواتر چھوٹے چھوٹے آبشاروں پہ جھرجھراتی، بڑے بڑے پتھروں کو کتراتی نکلتی ہوئی چٹانوں کی گھوم پر سنسناتی اس باغ کے بیچوں بیچ میں لہراتی ہے۔

در اصل یہ چھوٹی سی وادی باغ ارم کا ایک نمونہ ہے جسے سربفلک گورا ایک طرف سے اور ناقابلِ گزر سیدھا کگار لیے ہوئے چاندنی کا سلسلہ دوسری طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اسی قلعہ کے جنگلی گلاب کی جھاڑیوں میں یا ببت کی ٹھنڈی بیلوں کے اندھیرے سایے میں جنگل کا بادشاہ، گیارہ فٹ سیاہ دھاریوں والا سنہرا شیر دن بھر غفلت کی نیند سوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب چڑیاں چہچہانا بند کر کے ڈالیوں میں دبک دبک کر بسیرا لینے لگتی ہیں اور لاکھوں جگنو چمک چمک کر کالی کو بقعۂ نور بنا دیتے ہیں تو پھر انگڑائیاں لیتا ہوا اور عاؤں عاؤں کرتا ہوا بادشاہ ٹہلتا ہوا ندی کے کنارے آتا ہے۔ دو چار کانکر (ایک چھوٹا ہرن ہوتا ہے لیکن کتے سے بہت ملتا ہے۔ بادامی کھال کتے کی سی ہوتی ہے۔ دانت بھی کتے کے سے ہوتے ہیں۔ یہ بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتا بھونک رہا ہے) جو یہاں رہتے ہیں، بھونک بھونک کر گورا کی چڑھائیوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہاں چوپائے بالکل کم ہیں کیونکہ باوجود درختوں، پودوں اور گھانسوں کی کثرت کے کھانے کے قابل کوئی سبزہ یہاں نہیں ہے۔ غذا ترائی کے جنگل ہی میں کثرت سے ہے۔ اس لئے سانبھر نیل گائے، چیتل اور پاڑے چاندنی کے دامن ہی میں رہتے ہیں۔

البتہ جب کبھی دو ٹانگوں والے جانور آگ اگلنے اور گرجنے لکڑیاں لے کر آجاتے ہیں تو پھر یہ جانور ان ظالموں کے خوف سے چاندنی کی چوٹیوں پر چڑھ کر خطرناک اور دشوار راستوں سے دوسری طرف نیچے اتر کر کالی کے گوشۂ عافیت میں پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہاں ان کو شیر کے پہلو بہ پہلو رہنا پڑتا ہے، لیکن پھر بھی ان کو یہ گوارا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ اس جنگل میں ٹھہریں جہاں کہ ظالم اور بے رحم انسان آگیا ہو۔ شیر باوجود درندہ ہونے کے جنگل کا رہنے والا ان کا ہمسایہ ہے۔ جس کی موجودگی ان کو چار و ناچار گوارا کرنی پڑتی ہے۔ وہ جنگل کا بادشاہ ہے جس کو کہ ہر ہفتے ان کے گلہ میں سے کسی ایک گلہ کو جان کا خراج دینا ہوتا ہے۔ لیکن وہ انسانوں کی طرح ظالم نہیں ہے۔ وہ بلا ضرورت جان لینے اور خون بہانے کے واسطے کبھی شکار نہیں کرتا ہے۔ جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تو وہ ان کے سامنے تک نہیں آتا اور اگر سامنا بھی ہو جائے تو فوراً ہٹ جاتا ہے۔ اس کو چوپاؤں کو بلا وجہ ڈرانے کی عادت نہیں۔ جب بھوکا ہوتا ہے تو مجبوراً کسی ایک گلہ کو تاک کر اس کے سب سے کمزور ایک نفر کو اس خوبصورتی اور چالاکی سے دبا بیٹھتا ہے کہ اکثر گلہ کو پتہ بھی

نہیں چلتا کہ ان میں سے ایک کم ہو گیا ہے۔ شکار مار لینے کے بعد اگر جانور بڑا ہے تو باسی اور تباسی تک کھاتا ہے۔ یہاں تک کہ شکم سیر ہو کر کسی اندھیرے اور ٹھنڈے مقام پر جا لیٹتا ہے۔ جہاں سے وہ چار دن تک سوائے پیاس بجھانے کی ضرورت کے نہیں نکلتا۔ حتیٰ کہ ساتویں یا آٹھویں دن ایک دفعہ پھر بھوک اس کو پریشان کرتی ہے تو وہ رات کے اندھیرے میں گھنی جھاڑیوں میں چھپتا، درختوں کی آڑ لیتا دبے پاؤں نکلتا ہے۔ جنگل کو کھلبلا دینا اور جانوروں پر ہیبت طاری کر دینا اس کا کام نہیں۔ یہ گلوں کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے، اور ان میں سے بالکل اسی طرح خوراک حاصل کرتا ہے جیسے کہ ایک دور اندیش مالی اپنے کھیتوں میں سے ترکاری بتدریج نکالتا ہے۔ گوشت کو برباد اور ضائع کرنے سے اسے نفرت ہے۔ ہر جانور اس کی کھیتی ہے۔ جس کے بچوں سے اس کے گلے قائم ہیں۔ جب کوئی جانور بڈھایا کمزور ہو کر نسل کا سلسلہ آگے بڑھانے کے ناقابل ہو جاتا ہے تو پھر جنگل کا بادشاہ اس پکے اور ٹپک جانے والے پھل کو چپکے سے توڑ کر کھا لیتا ہے، گلے اس سے ڈرتے ضرور ہیں لیکن اس کی ہیبت ان کے دلوں پر نہیں ہے۔ اس کا تعاقب ان کے لئے ایک کبڈی ہے جس میں کہ وہ پوری دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں اور اگر ان میں سے کسی ایک کو شیر کی چستی اور چالاکی سے شکست ماننا بھی پڑتی ہے تو انکو مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اس بد نصیب ساتھی پر کیا گزری۔ اور در اصل گزرتی بھی کیا ہے۔ شیر کا بھاری جسم ایک ہی جست میں اس کی کمر پر گرتا ہے جس سے کہ فوراً کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ دوسرے سکنڈ میں دو سخت جھٹکے گردن کی گرہیں گرہیں الگ کر دیتے ہیں۔ دو منٹ نہیں لگتے کہ جانور کی تمام تکلیفیں دور ہو جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے جس وقت انسان قتل اور غارت کے جذبے سے بھرا ہوا جنگل میں گھس جاتا ہے، تو یہاں کی دنیا ہی خوف و ہراس سے درہم برہم ہو جاتی ہے۔ وہ بلا ضرورت اور بلا امتیاز جانیں لیتا ہے اور صرف غارت گری کے لئے۔ ظلم پر ظلم یہ ہے کہ جتنے جانور وہ ہلاک کرتا ہے۔ ان سے زیادہ زخمی خون میں نہائے جنگل میں مارے مارے پھرنے، دنوں ہفتوں بلکہ مہینوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔

کبھی کبھی چاندنی کے ان جانوروں کو بھی وحشی انسان کی اس غارت گری کا سامنا کرنا پڑتا

ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کیونکہ ٹنک پور منڈی اور ان پہاڑیوں کے درمیان کئی خطرناک دلدلیں اور نہایت گھنے جنگل ہیں۔ جنھوں نے چاندنی کی پہاڑیوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ عرصہ سے یہاں جانور بے خوف و خطر پر امن زندگی بسر کر رہے تھے کہ یکایک ہلکی سی ایک بے چینی ان کی دنیا میں پیدا ہوئی یعنی بیرو دفعتہً نمودار ہوئے اور مجنوں کی طرح یہاں کی نیل گایوں کی ڈار کے پیچھے پھرنے لگے۔ نہ اس ڈار کو ہی ایک جگہ قرار تھا اور نہ یہ دوسرے ہی جانوروں کو اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے دیتا تھا۔ ان کے نر نے پہلے تو دلیرانہ مقابلہ کر کے بیرو کو بھگا دینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جب دیو ہیکل حریف کے مقابلہ میں متواتر شکستیں اٹھا کر کئی زخم کھا چکا تو پھر مقابلہ کرنا چھوڑ دیا۔ بس اتنا ہی کرتا تھا کہ بیرو کو دور سے دیکھتے ہی مقابلہ کی تمام تیاریاں کر کے سینگ نیچے کھریاں جما کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دشمن قریب آیا تو پھر بھاگ پڑا۔ اس عرصے میں مادائیں کافی دور نکل جاتی تھیں۔ چھریرے بدن کا جنگلی نیلا چار چھلانگوں میں پھر ان سے جا ملتا اور بھاری بھرکم بیرو اپنی سست رفتار میں پھر ان کا تعاقب شروع کر دیتا تھا۔

چاندنی کی پہاڑی ابھی اسی پریشانی میں تھی کہ ایک مصیبت اور نازل ہوئی۔ ایک قد آور، چڑچڑا اور بدمزاج سفید ریچھ اپنی زخمی مادین کے ساتھ گوراپار کی آٹھ ہزار فٹ کی اونچی برف کی چوٹیوں سے اترا۔ گوراپار کر کے کالی کے کنارے آگیا۔ جہاں سے آگے بڑھنے کی سکت اس کی مادین میں نہ رہی۔ کسی شکاری کی گولی سے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے وہ کچھ نہ کھا سکتی تھی کالی کے کنارے پانی پی پی کر بھوک اور زخم کی تکلیف میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کے آخری دن پورے کرنے لگی۔ اس عرصہ میں سفید ریچھ نے جو کہ قدرتاً بدمزاج ہوتا ہے، اب اور بھی زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ بلا امتیاز چھوٹے یا بڑے جنگل کے تمام جانوروں کی زندگی دوبھر کر دی۔ ریچھ کے جو بھی سامنے پڑ گیا بھاؤں بھاؤں کر کے اسے جھنجھوڑ ڈالا، پنجے مار مار کر حیثیت بگاڑ دی۔ ندی پر جا بیٹھا تو پانی پینے کے گھاٹ بند کر دیئے۔ چاندر میں گھس گیا تو چوپاؤں کی دن کی نیند اور جگالی حرام کر دی۔ ایک ہلچل سی مچا دی اور جب آٹھویں دن اس کی زخمی ریچھنی مر گئی تو اسکا جنون اور بھی بڑھ گیا۔ جانوروں نے چراگاہیں چھوڑ دیں۔ بندھے ہوئے گھاٹ بدل گئے۔ انکی

بیٹھکیں اجڑ گئیں۔ اس ہلچل سے شیر بھی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ شکار بھڑکا ہوا تھا۔ بہت سخت دوڑ دھوپ کرنا پڑتی تھی۔ بندھے ہوئے راستوں اور گھاٹوں پر پڑے پتھروں یا سال کے موٹے دو شاخوں کی آڑ میں پہ گھنٹوں بیٹھ کر انتظار کرتا لیکن کوئی ڈار ادھر سے نہ گزرتی۔

آج بھی وہ سخت غصے اور پریشانی میں تھا۔ بھوک کی آگ پیٹ میں لگے دو راتیں ہو چکی تھیں۔ تیسری رات نمودار ہو رہی تھی کہ بھوک سے بیتاب شیر پوستین جھٹکتا، شانے اور پیر زبان سے صاف کرتا گھنے گلاب کی اندھیری جھاڑی میں سے نکل کر کالی کی طرف جھاڑیوں جھاڑیوں روانہ ہوا۔ ایک گستاخ خرگوش نے کچھ دور اس کے پیچھے خرلیش کی اور پھر غائب ہو گیا۔ ندی کے کنارے جونہی اس نے پانی پینا شروع کیا ایک مور نے اسے دیکھ لیا۔ وہ چلایا اور اس کے چلانے سے گرد و نواح کے دس بارہ مور اور چلائے۔ جنگل میں پھر سکوت چھا گیا۔ شیر نے پانی پی کر پانی کو کچھ بغور دیکھا۔ پھر مڑ کر چار قدم چلا اور رک گیا۔ بڑی دیر تک دُم کو آہستہ آہستہ جنبش دیتا اور کانوں کے کٹورے گھماتا خاموش کھڑا رہا۔

آٹھویں تاریخ کی ہلکی سی چاندنی پتوں میں سے چھن چھن کر کہیں کہیں اس کے جسم پر پڑ رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ سوائے آبشاروں کی مدھم میٹھی رم جھم رم جھم کے باقی تمام سکوت ہی سکوت تھا۔ خوبصورت، لوچیلے، نازک، معصوم شیر نے دفعتہً ایک جھرجھری لی۔ وہ کچھ معلوم کر رہا تھا، اب اسکا مطلب حل ہو گیا تھا۔ وہ پھرتی سے پھر مڑا۔ لمبی ڈلکی کے دو قدم میں کالی تک آیا۔ اس کے جسم نے بغیر جھکولا لئے یا ہاتھ پیروں کے پٹھے تانے پینگ سا لیا اور وہ کالی کے پار تھا، اس کے لئے بارہ فٹ کا فاصلہ ہی کیا تھا۔ ویسے ہی نکل گیا۔ یہاں سے پھر اسی لمبی دبی ہوئی ڈلکی میں چند سکنڈ نہ لگے تھے کہ تین سو فٹ اوپر گورا کی چڑھائی کی ایک نکلی ہوئی نوک پہ پہنچ گیا اور یہاں چند پتھروں کی آڑ میں دبک کر چاندنی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ جس جگہ کہ اب شیر بیٹھا ہوا تھا، یہاں سے کالی کے دونوں طرف کے جنگل، سامنے کی چڑھائیاں اور چاندنی کا گگرا بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ شیر دُم کو اپنے پہلو میں سمیٹے منہ کھولے ہلکے ہلکے ہانپتا ہوا تیزی سے آنکھیں ادھر ادھر گھماتا ہوا سامنے کی کھڑی چڑھائی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً دیکھ جس کی کہ بڑا سے ندی کے کنارے ہی آ گئی تھی سامنے پتھروں پر آہستہ آہستہ

بھدّے پن سے چڑھتا نظر آ رہا تھا۔ شیر کا کھلا ہوا منہ بند ہو گیا۔ دُم لٹھیا کی طرح پیچھے جا پڑی اور دُم کی پتلی نوک ناگن کی طرح دائیں بائیں لہرانے لگی۔ شیر بار بار دبکا ہو پنجوں کے بل سُدھر سُدھر کر بیٹھنے لگا۔ وہ یہ انتظار کر رہا تھا کہ زیچھ کگارے پہ پہنچ جائے اور وہ دیکھ لے کہ کس راستے سے زیچھ اوپر گیا ہے۔ زیچھ آہستہ آہستہ ایک ایک جڑ اور ڈالی پکڑتا ہوا آخر اوپر پہنچ گیا اور زبردست آنولے کے درخت نیچے جہاں کہ زمین کافی ہموار تھی نظروں سے غائب ہو گیا تو پھر جنگل کے بادشاہ نے جنبش کی۔

اب جو چلا تو معلوم ہوا کہ دراصل شیر ہے۔ جس طرح بجلی کوندتی ہے۔ چار جستوں میں یہاں سے نیچے تھا۔ ندی کے آٹھ فٹ اُدھر ہی سے ایک چھلانگ ماری اور تیس فٹ ہوا میں اڑتا ہوا پار کی گھنی جھاڑیوں کے اندھیرے میں غائب ہو کر دو منٹ بعد پانچ سو فٹ اوپر کھڑی چٹانوں اور پتھروں میں ناگن کی طرح لہراتا ہوا نظر آیا۔ یہ اس طرف نہیں جا رہا تھا جہاں کہ زیچھ گیا تھا۔ بلکہ آنولے کے درخت سے کافی مغرب کی طرف ہٹا ہوا ایک ایسے کھڑے کگارے کی طرف جا رہا تھا کہ جہاں پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔

شیر اس چڑھائی کو اس طرح چڑھ رہا تھا کہ آنکھ کام نہ کرتی تھی۔ ابھی ایک پتھر پر ہے اور پھر جو دیکھا تو اس سے بہت اوپر کسی دوسری چٹان کے سہارے جا رہا ہے۔ چڑھتے چڑھتے یہ ایک ایسی جگہ پر پہنچا جہاں نہ صرف پہاڑ بالکل دیوار کی طرح سیدھا تھا بلکہ بیس فٹ اوپر ایک چٹان چھجے کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ رک گیا اور اس کے چاروں ہاتھ پیر سمٹے، پیٹ اور سینہ زمین سے چھو لیا اور پھر نگاہ کو مات کر دینے والی تیز چھلانگ میں وہ اوپر کی چٹان پر تھا۔ لیکن اس چٹان سے اوپر اب کوئی باہر نکلی ہوئی چٹان یا پتھر نہ تھا بلکہ خالص ایک ہزار فٹ کی سیدھی کھڑی دیوار کے اوپر دور بہت زبردست پتھروں کے درمیان سے نکلی ہوئی ایک چٹان اس چڑھائی کا آخری زینہ تھی۔ چنانچہ شیر نے اب ایک پتلی اور نہایت خطرناک پگڈنڈی پکڑ لی جو کہ بہت گھماؤ کے بعد سانپ کی طرح بل کھاتی آخر پھر اسی ایک ہزار فٹ اوپر کی طرف نکلی ہوئی چٹان پر آ ملی تھی۔

ہو کر دنیا بھر کی صعوبتوں اور سختیوں کا سامنا دیوانہ وار کرتا ہے۔ یہاں تک صحرائے نجد کی وسعتیں سمٹ جاتی ہیں۔ دامانِ کوہ پھٹ کر جوئے شیر رواں ہو جاتے ہیں۔ تاج و تخت کے ہیرے جھونپڑیوں کے چراغوں کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ صدائے عشق کے آگے لن ترانیاں بھی خاموش ہو جاتی ہیں اور چونکہ عشق محض ایک حیوانی جذبہ ہے۔ (جیسا کہ ہر پینتالیس سے اوپر کی عمر کا انسان جان چکا ہے۔ خواہ وہ اس کا قائل ہو یا نہ ہو) اس لئے بیرد پر اس کا اثر اسی حد تک اور زیادہ تھا۔ چلبلی ماداؤں کی وہ ادائیں، ان کی میٹھی میٹھی وہ صدائیں، مشک عنبر سے بہتر ان کی وہ مست بوئیں سر شوریدہ میں طوفان بسر طوفان برپا کر رہی تھیں۔

جنگلی نیل گائے دن رات کے تعاقب، دن رات کی دوڑ دھوپ سے پریشان، بھوک اور پیاس سے ہلکان، زخموں سے چور دن بدن کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن جب کہ دن کی تیز روشنی ختم ہو کر ہر طرف رات کا سہانا اندھیرا چھا چکا تھا جبکہ بارہ ماسی اوس اونچے درختوں سے ٹپ ٹپ گر رہی تھی، اور جب کہ دو بن رکھی چڑیاں ایک دوسرے سے دو میل کے فاصلہ پر سے "ترا تو تو تو"، کے جواب سوال میں متواتر بحث کر رہی تھیں۔ جنگلی نیل گائے بیرد کے مقابلہ سے آخری دفعہ بھاگا۔ اس نے مکمل شکست قبول کر لی۔

اس دائمی تعاقب سے اپنی جان چھڑانے کے لئے وہ ماداؤں سے دست بردار ہو کر ڈار سے دوسری طرف بھاگا۔ بے نر کی ڈار لاوارث بنی ہوئی چاندنی کی ڈھال پہ بیرو سے ڈیڑھ سو فٹ اوپر کھڑی تھی۔ بیرد اس طرف روانہ ہوا۔ مگر مادینیں حسب دستور اس سے ڈر کر بھاگ پڑیں۔ بیرد کی سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہ آیا کہ وہ پھر اس نر کا تعاقب کرے، اس کو شکستِ فاش دے بلکہ ہلاک کر ڈالے۔ ادھر جنگلی نیل گائے نے ان سب جھگڑوں کو چھوڑ کر چاندنی کے کنگارے کا رخ کیا۔ جہاں سے وہ اوپر ہی اوپر جا کر مشرق کی طرف سے کھیر کے گھنے جنگل میں اتر جانا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی وہ ان دو بڑے پتھروں کے پاس پہنچا جن کی آڑ میں ایک بڑی چٹان چھجے کی طرح ایک ہزار فٹ کی بلندی پر نکلی ہوئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت شیر بھی وہاں آ چکا تھا۔ شیر آیا تھا تو ریچھ کو سزا دینے، لیکن اسے خوراک کی بھی سخت ضرورت تھی۔ بھوک سے بے تاب تھا۔ چھ گز کے فاصلہ پر بڈھا زخمی نیل گائے جا رہا تھا۔

دونوں بارہ چودہ فٹ کے موٹے پتھروں کے بیچ میں تین فٹ کی گلی سی تھی۔ اس میں سے وہ جھپٹا اور نیل کو گرالیا۔ دو چار جھٹکوں میں شکار بے حرکت ہو گیا۔ عادات کے موافق شیر کو فکر ہوئی کہ کسی پوشیدہ تنہائی کی جگہ پر گھسیٹ لے جائے اور پھر کھانا شروع کرے، لیکن پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پشت پر کی چٹان بھی کافی تنہائی کی جگہ تھی یا کم از کم ناشتہ کر لینے کے واسطے کچھ دیر کے لئے شکار وہاں بھی کھایا جاسکتا تھا۔ گردن پر سے جہاں اس کے کیلے گھس گئے تھے۔ خون کی دھاریں چل رہی تھیں تھوڑی دیر اس خون کو چاٹا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر نیل گائے کے پٹھے پر دانت جمائے۔ اگلے دونوں ہاتھوں سے ران اور کمر کو دبا کر منہ کو اوپر ایک جھٹکا دیا۔ تراخ کی ایک آواز ہوئی۔ ڈیڑھ سیر کا ایک ٹکڑا ران سے جدا ہو کر شیر کے منہ میں آگیا۔

اس تراخ کی آواز سے ریچھ جو کہ ان پتھروں کے پاس سے گزر رہا تھا ٹھٹک گیا۔ بھاری بھرا سر ہلا ہلا کر ادھر ادھر سونگھا "دو بوئیں مشترکہ" جھلا کر نیچے سے ناک کے بانسے کو دو دفعہ پونچھا اور دونوں پتھروں کے بیچ میں گھس گیا۔ بجلی کی طرح شیر شکار کو چھوڑ گھوم کے کھڑا ہو گیا۔ آندھی کی طرح ریچھ نے جھٹکا لیا اور راستہ روک کر سات فٹ اونچا تین فٹ چوڑا بھرا دیو پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ دھوکہ میں ریچھ آگیا تھا۔ موقع ایسا خراب تھا کہ اب ہٹنا ناممکن تھا۔ اگر وہ ایک انچ بھی گھومتا ہے تو شیر اس کو دبا لیتا ہے۔ اس لئے سیدھا کھڑا دونوں ہاتھ آگے کو پھیلائے مقابلہ کے لئے تیار تھا۔ شیر بھی اسی طرح آمنے سامنے ہو کر حملہ کرنے سے ہمیشہ بچتا ہی رہتا ہے اور اب یہ دیو ہر طرح سے تیار کھڑا ہے۔ کس طرح کس پہلو سے حملہ کرے۔ دونوں مد مقابل ایک منٹ تک اسی حالت میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ شیر چاہتا تھا کہ اس کا دشمن ذرا بھی جھکے اور وہ اس کی پیٹھ پر جا پڑے۔ ریچھ اس داؤ میں تھا کہ شیر ذرا بھی اٹھے کہ وہ اس کے پیٹ کے نیچے گھس جائے۔ اسی خیال سے ریچھ کچھ آگے جھکا ہی تھا شیر نے تڑپ کھائی۔ دونوں ہاتھوں کے ناخون پسلیوں میں اور دانتوں کے کیلے ریچھ کی کمر میں ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف گھسا دیئے۔ ریچھ کا بھاری سر اور کھڑکھڑاتے ہوئے بڑے بڑے ناخنوں سے آراستہ دونوں ہاتھ شیر کے پیٹ کے نیچے تھے۔ ایک سکنڈ بھی نہ لگا کہ شیر کی آنتیں نکل کر ان میں الجھی ہوئی تھیں۔

ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور ادھر عشق کا بھوت حسبِ دستور سر پر سوار بیرو کو اندھا بنا لے لئے پھر رہا تھا۔ جنگلی نیلے کی بو پر وہ چلا آ رہا تھا۔ سب بوؤں سے بے خوف اور بے خبر آخر وہ اس جگہ ہی آ گیا۔ جونہی وہ دونوں پتھروں کے اندر داخل ہوا۔ اس کو یہ سین دکھائی دیا۔ چھوٹی سی نکلی ہوئی چٹان پر نیلا بے حس و حرکت پڑا تھا۔ دوسری طرف دو زبردست ایک دوسرے میں گتھم گتھا زور کر رہے تھے۔ بیرو کو بھی اپنی طاقت پر ناز تھا۔ پھر خطرے کے موقعے پر حملہ کرنا قدرت نے اسے سکھایا تھا۔ اس کا سر نیچا ہو گیا۔ بھاری گردن اینٹھ کر درخت کا لٹھ ہو گئی۔ نو من کا سیاہ جسم اپنا پورا وزن لگانے کو تیار ہو گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر جو لپک کر ایک ٹکر لگاتا ہے تو شیر اور ریچھ دونوں تین پلٹے کھا کر چٹان کے نیچے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر سے قلابازیاں کھاتے نیچے گر رہے تھے۔ ان کے لہو سے رنگی ہوئی چٹان پر بیرو کا کنٹھا پڑا تھا جسے بیرو نے بڑے افسوس سے دیکھا۔ شیر نے ایک پنجہ اس پر بھی چلایا تھا۔ لیکن اوچھا پڑا تھا۔ جس سے صرف کنٹھا ہی ٹوٹا۔ گردن پر زخم نہیں آیا۔ شیر اور ریچھ ایک ہزار فٹ کی مسافت طے کر کے جس وقت نیچے کی دوسری چٹان سے ٹکرائے تو بڑے زور کا دھماکہ ہوا جس کی آواز دیر تک وادی میں گونجتی رہی اور ابھی یہ گونج ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک دھماکہ پھر ہوا اور پھر وادی اور اطراف کے پہاڑ گونج اٹھے۔ اب کی دفعہ بیرو نے اس نیلے کی لاش کو بھی نیچے ڈھکیل دیا تھا۔ اب خون آلودہ چٹان خالی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ بیرو وہاں ساکت کھڑا تھا۔ یکایک "پی قوں پی قوں" کی پیاری پیاری آوازیں اس کے کان میں آئیں۔ مغرب کی طرف بیرو سے سو سوا سو فٹ اونچی ایک چوٹی پر مادینیں کھڑی ہوئی اسے بلا رہی تھیں۔

اور ان میں وہ جا ملا۔

فیض احمد فیضؔ

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بیوفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کہ پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیِ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیِ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

اخترالایمان

اجنبی

تو ہے کچی کونپل اب تک جس کے لوچ میں پیار ہی پیار
اور میں گرمی سردی چکھے ڈالی پر اک تنہا پات
تو سچّا موتی میں ہیرا، بکھرا جو برسوں ہاتوں ہات
تو اوشا کی پہلی کرن ہے اور میں جیسے بھیگی رات
تو تاروں کے نور کی دھارا، میں گہرا نیلا آکاش
میں ہوں جیسے ٹوٹتا نشہ، تو ہے جیسے شاخِ نبات
تو ہے ایک ایسی شہنائی جس کی دھن پر ناچے موت
تیری دنیا جیت ہی جیت ہے، میری دنیا چھوڑ یہ بات!
تو ہے ایک پہیلی جسکو جو بوجھے وہ جان سے جائے
تو ہے ایسی مٹی جس سے لاکھوں پھول چڑھیں پروان
آئیں تیرا انگ کبھی چھو دوں، چھوڑ یہ بھید اور بھاؤ کی بات
میں نے وہ سرحد چھو لی ہے، جہاں امر ہو جائیں پران
اے آنکھوں میں کھبنے والی جانے کون کہاں رہ جائے
جیون کی اس دوڑ میں پگلی، ہم دونوں ہیں آج انجان
لیکن اے سپنوں کی مایا تو چاہے تو روگ ہٹیں
میں نے دنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان
جیون کی اس دوڑ میں ناداں یاد اگر کچھ رہتا ہے
دو آنسو، اک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان!

مخدوم محی الدین

سب کا خواب

وہ شب مے وہ شبِ مہتاب میری ہی نہ تھی
وہ توسب کا خواب تھا

وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا، میرا ہی نہ تھا
وہ توسب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے
میرے دل میں ہی نہ تھے
وہ توسب کا خواب تھا

لاکھ دل ہوتے تھے، لیکن
جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح
جب مچلتے تھے تو اک دل کی طرح
جب اچھلتے تھے تو اک دل کی طرح۔
جب مہک اٹھتے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
والگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دل
آپ میں اک گرمیٔ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہوگئی
چاندنی سی میٹھے دل کے پاس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہوگئی

خلیل الرحمن اعظمی

ذاتیات

جو مجھ پہ بیتی ہے
اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا
جو دکھ اٹھائے ہیں
جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں
ان کو کہنے کا مجھ میں یارا نہیں ہے
میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں
داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگزشت میری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں
مجھکو لگتا ہے لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
تو راہ چلتے میں ٹوک کر،
مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے

شاذ تمکنت

بارِ وفا

پھر وہی آنکھیں، وہی میری طرفدار آنکھیں
مسکراتی ہوئی، سرشار ملنسار آنکھیں
نارسیدہ یہ تمنائیں، یہ ارمان ترے
صاف آمادۂ شب خوں یہ پلک بان ترے
یہ کھلی زلفیں، یہ شب زادیاں نکہت بر دوش
اُف یہ دوشیزگیٔ بر، یہ کنواری آغوش
راہِ عصیاں سے اُبلتی ہوئی یہ جوئے ثواب
معبدِ جسم، یہ کندن کے کلس یہ محراب
سپر افگندہ نگاہوں میں مناجات لئے
ہمہ تن آرزوئے دید و ملاقات لئے
تو کہ ہے منتظرِ جرأتِ اظہارِ وفا
پھر وہی بارِ وفا، پھر وہی تکرارِ وفا
درد سرشار ہوں، لذت کشِ آزار ہوں میں
صورتِ نقش ہوں میں، صورتِ بیمار ہوں میں

کیا کہوں تجھ سے مری سانس رُکی جاتی ہے
تیرے پہلو میں کسی اور کی یاد آتی ہے

زبیر رضوی

خارجی شکست

مجھے آج پھر تم سے مل کے بڑی نا اُمیدی ہوئی ہے
وہی طرزِ گفتار، چہرے پہ گہری اداسی کا عالم
زمانے کی بیداد، حالات کی کج ادائی کا شکوہ
تگ و تاز، تقدیر کی نارسائی کا ماتم
تہی دامنی پر پشیمان ہونے کی معصوم کوشش
جواں، خوبصورت مہکتے ہوئے روز و شب کا تصور
نشاط آفریں محفلوں میں کبھی باریابی کا ارماں
گلابوں کی مانند کھلتے ہوئے جسم چھونے کی خواہش

مجھے کب سے حسرت ہے اک شب کبھی تم
مری محفلِ ناز میں یوں بھی آتے
مجھے جسم و جاں کی سبھی راحتیں سونپ دینے میں کوئی تکلف نہ ہوتا!

جمیل ملک

سب رنگ

رنگِ تصویر ہوں میں
تو نے اک ماں کی طرح مجھ سے محبت کی ہے
کوئی حد بھی ترے ایثار و عقیدت کی ہے

حسنِ تاثیر ہوں میں
جیسے بچی کسی گڑیا پہ مچلتی جائے
میں نظر آؤں تو روتے میں بہلتی جائے

جانِ تنویر ہوں میں
جیسے بھائی کو بہن چاند میں ہنستا دیکھے
اپنی نوخیز محبت کا تماشا دیکھے

کیفِ تعبیر ہوں میں
تو نے خوابوں کے جزیروں میں پکارا مجھکو
تو نے محبوبۂ جاں بن کے نکھارا مجھکو

تیری تقدیر ہوں میں
تو نے دلہن کی وفا سے مری جھولی بھر دی
اپنی جاں بھی مرے قدموں پہ نچھاور کر دی

فن کی توقیر ہوں میں
جو بھی مانگا ہے وہی تو نے دیا ہے مجھکو
تو نے سو رنگ میں تخلیق کیا ہے مجھکو

صغیر احمد صوفی

شعلۂ خاموش

کہاں سے آئی تھی مبہم پیام کی خوشبو
اندھیری رات میں جگنو کی جوت تھی شاید

وہ دردِ ہجر کہ ہر سمت ہے دھواں غم کا
بھٹک رہا ہوں میں وہم و گماں کی وادی میں
لئے عذابِ محبت کا سرد انگارہ
کہاں چھپاؤں میں تشنہ دہن امنگوں کو
ہیں جن کے راز کسی انجمن سے وابستہ
خموش رہئے تو جلوؤں پہ حرف آتا ہے
کھلے زباں تو غیرت پہ آنچ آتی ہے
ہے بند اپنے لئے سرخوشی کا دروازہ
بکھر رہا ہے خیالوں کا جیسے شیرازہ

نظر جو آیا تھا مبہم پیام کا جلوہ
دیارِ غیر کا اک اجنبی ستارہ تھا
افق پہ دل کے طلوع و غروب ہو بھی چکا
مرے لئے تو یہی زندگی ہے روزِ حساب
ملی ہے کاتبِ تقدیر سے سزا مجھکو
تمام عمر بھٹکتا رہوں ہوا کی طرح
تمام عمر سلگتا رہوں چتا کی طرح

شہریار

سوال

سحر دم گلِ نو کے شانوں کو چھوتا
کوئی تیز رفتار جھونکا ہوا کا
گزرنے لگا جب تو دامن سے اس کے
لپٹ کر کسی زرد رُو گل نے پوچھا

"گلِ نو کے شاداب چہرے کو شبنم کا آنچل
پگھلتے ہوئے دن کی آنکھوں سے کب تک
چھپائے رہے گا؟"

راج نرائن راز

فیصلہ

آنکھیں تک ہیں دید سے قاصر
کمرے میں کیسا یہ دھواں ہے
اتنی گھٹن ہے، دم گھٹتا ہے!
نقش جو تھے اک عمر کا حاصل
نقش جو تھے جینے کا بہانا
اب ہیں مبہم، مدھم، مدھم
زیست دوراہے پر ہے گُم سُم
کتنی گھٹن ہے، دم گھٹتا ہے!
ایک دریچہ اب بھی وا ہے
اُف یہ بونوں کی بستی ہے!
کون دریچے میں سے پھاندے
کون یوں اپنا آپ گنوائے!

خلیل الرحمٰن اعظمی

اختر الایمان — ایک متحرک شاعر

سنہ ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ اردو نظم میں مواد، طرزِ فکر، ہیئت اور اسلوب و اظہار کے اعتبار سے جو نئے میلانات سامنے آئے ان میں سے بیشتر اپنے امکانات ختم کر چکے ہیں۔ ماضی قریب کے یہ شعرا جنھوں نے اپنے دور کے نوجوانوں کی مضطرب اور بے قرار روح کی ترجمانی کی تھی، ہمارے لئے اب دور کی آواز معلوم ہوتے ہیں۔ اختر الایمان ان معدودے چند شعرا میں ہیں جن کی شاعری اب بھی اپنے اندر نمو اور بالیدگی رکھتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نوع کی شاعری کو پھلنے پھولنے کے لئے اب زیادہ سازگار فضا میسر آرہی ہے۔ ان کی نظموں کا مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا سرچشمہ بھی اپنے زمانے کے مخصوص حقائق ہیں لیکن ان کا شعری رویہ اور فنی طریق کار اس عہد کے عام شعرا سے مختلف رہا ہے۔ اس زمانے کی مقبول عام نظمیں اکبری شاعری کا نمونہ ہیں۔ ان میں جذباتی وفور اور ایک والہانہ انداز تو ہے لیکن ان کا محرک شاعر کا فوری ردعمل ہے۔ اس لئے ان نظموں میں ایک ہیجانی کیفیت اور بعض اوقات ایک طرح کی اعصاب زدگی ملتی ہے۔ اس ہیجانی کیفیت کی وجہ سے شاعر جزوی حقیقت کو ہی پیش کرنے پر ہی قناعت کر لیتا ہے۔ اس زمانے کے بیشتر شعرا نے اپنی نظموں میں رومانی انداز اختیار کیا اور یہ رومانیت ان کے مزاج پر اس طرح مسلط ہو گئی کہ وہ اب تک اس سے چھٹکارا نہ حاصل کر سکے۔ سیاسی شاعری، انقلابی شاعری، جنسی شاعری اور موضوعات کے اس طرح خانے بنانے کی رسم اس زمانے میں عام تھی اور یہ خانے اسی وقت آسانی سے بن جاتے ہیں جب شاعر پوری زندگی ایک اکائی کی حیثیت قبول کرنے کے بجائے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دیتا ہے۔ ترقی پسند شاعری اور جدید شاعری کی تقسیم بھی ہم نے اسی میکانکی انداز میں کر رکھی تھی یعنی سیاسی مسائل پر لکھنے والوں کو ترقی پسند اور جنسی یا دوسرے مسائل پر لکھنے والوں کو غیر ترقی پسند یا جدید شاعر کہنے لگے یا اجتماعی مسائل کو اہمیت دینے والے

ترقی پسند اور ذاتی و داخلی مسائل کا اظہار کرنے والے فراری اور رجعت پسند کہلائے جانے لگے۔ اس زمانے کی تخلیقات کو معروضی طور پر دیکھئے تو ترقی پسند اور غیر ترقی پسند میلانات دو طرح کے شعراء میں مل جائیں گے۔ اختر الایمان ان دو ایک شاعروں میں سے ہیں جن پر آسانی سے کوئی لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے یہاں خارجی زندگی کا ادراک بھی ہے اور فرد کی داخلی زندگی کے پیچیدہ اور متنوع مسائل بھی، سیاسی اور اجتماعی محرکات بھی ہیں اور جنسی اور عشقیہ بھی۔ شعری روایات سے استفادہ بھی ہے اور نئے اسالیب و اظہار کی جستجو بھی۔ ان کی نظموں میں نہ تنہا موضوع اور طرز فکر کو اہمیت حاصل ہے اور نہ ہی ہیئت کا کوئی چونکا دینے والا تجربہ۔ ان کے یہاں اظہار و بیان کے بعض اہم تجربے ہیں لیکن وہ موضوع سے اس قدر مربوط و ہم آہنگ ہیں کہ نامانوس اور اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ اختر الایمان کو اس دور میں زیادہ مقبولیت نہ حاصل ہو سکی۔ اس کے دو اسباب سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ ان کی شاعری کو کسی ایک خانے میں رکھنا مشکل ہے۔ اسی لئے واضح طور پر کسی گروپ سے متعلق نہیں کئے جا سکتے۔ وہ زمانہ ہمارے ادب میں تحریکوں کا زمانہ تھا اور اسی ادب کو قبول عام کی سند ملتی تھی جو کسی ایک تحریک یا رجحان سے باقاعدہ وابستہ ہو۔ اختر الایمان نہ تو ترقی پسندوں میں پوری طرح کھپتے تھے اور نہ حلقۂ ارباب ذوق کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ کئے جا سکتے تھے۔ جس نے نظم نگاری میں ایسے تجربے کرنے شروع کئے تھے جو ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ حالانکہ میراجی سے ان کے ذاتی تعلقات بہت گہرے تھے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ انکی تہہ دار اور سنجیدہ نظموں میں اس دور کے ہیجانی مزاج کے لئے تسکین کا کم سے کم سامان تھا۔

اختر الایمان کی شاعری کی ابتداہی فلسفیانہ جستجو سے ہوتی ہے۔ 'گرداب' ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۴ء میں شایع ہوا۔ یہ ان کے عنفوان شباب کا زمانہ ہے لیکن اس منزل میں ہی انھوں نے بعض بنیادی حقائق پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ فنا اور بقا کا مسئلہ، مٹتی ہوئی تہذیب کی پرچھائیاں، وقت اور اس کی ناگزیری، خیر و شر کی معرکہ آرائی، روشنی اور تاریکی کا تصادم، ظاہر اور باطن کی کشمکش، خواب اور حقیقت کی پیکار اور یاس و امید کی رزم آرائی۔ ان مسائل پر غور و فکر کا انداز تجریدی نہیں ہے بلکہ ان کا محرک ان کے اپنے زمانے اور ماحول کی روح ہے۔ اس روح کو ان کی نظروں نے عریاں دیکھ لیا ہے اور اس اندرونی تضاد کو محسوس کر لیا ہے جو اس المیہ کی بنیاد ہے۔ اس لئے ان نظموں میں ایک ایسی ڈرامائی کیفیت ہے جو اس پہلے اردو نظم میں عام طور پر نایاب تھی۔ 'گرداب' کی جن نظموں میں اختر الایمان نے بطور خاص اپنے مشاہدے اور فکر سے مکمل نقش گری کی کوشش کی ہے۔

وہ "مسجد"، "پرانی فصیل"، "تنہائی ہیں"، "موت"، "جواری" اور "پگڈنڈی" ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے براہِ راست یا بیانیہ پیرایۂ بیان اختیار کرنے کے بجائے علامتی اسلوب اختیار کیا ہے، اس لئے جو مناظر یا کردار ان نظموں میں آتے ہیں وہ بعض دور رس اور وسیع تر حقائق کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ان علامتوں کی پوری معنویت ذہن میں رکھی جائے تو یہ نظمیں اپنے محدود کینوس سے نکل کر لامحدود فضاؤں کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر "مسجد" ان قدروں کا استعارہ ہے جنھیں ہم مذہب کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس نظم میں "ندی" وقت کی علامت ہے جو نقش گر حادثات بھی ہے اور جو ہر اس شے کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے جس کی ضرورت باقی نہ ہو۔ اس نظم کو شاعر نے جس پس منظر میں ابھارا ہے وہ کچھ اسی نوعیت کا ہے جس سے ہم گرتے کی ایلچی میں دوچار ہوتے ہیں۔

گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آ کے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں

چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے
ڈال دیتے ہیں ستارے دھلی چادر اپنی
اس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے پہ بس اک
چشمِ نم کرتی ہے شبنم یہاں اکثر اپنی

ایک میلا سا، اکیلا سا، فسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھایا بھی کرو
ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے

اوپر کے بند میں "رعشہ زدہ" ہاتھ نمائندہ ہیں ان قوتوں کے جو اب بھی مٹتی ہوئی قدروں کو سینے سے لگائے

رکھنا چاہتی ہیں لیکن وقت کا جو دھارا اس تعمیر کو منہدم کرنے والا ہے اس کی ناگزیری شاعر نے محسوس کر لی ہے اس لئے نظم اس طرح ختم ہوتی ہے۔

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کے قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

اسی طرح "پرانی فصیل" اس دور کی اہم نظموں میں سے ہے۔ یہ نظم اس بحرانی دور کا مکمل اشاریہ ہے جس میں اخترالایمان اور ان کے ہمعصر شعراء نے آنکھ کھولی۔ پرانی تہذیب اپنے امکانات ختم کر چکی تھی اور اس کی قدروں میں کسی طرح کی سکت باقی نہیں تھی لیکن نئی تہذیب ہماری دسترس سے دور تھی۔ اس انتشار اور بحران میں شاعر نے بعض ایسے ہولناک مناظر دیکھے ہیں جو انتہائی کرب انگیز ہیں۔ کسے خبر تھی کہ اخترالایمان نے اپنی نظم میں جن حقیقتوں سے پردہ اٹھایا تھا وہ اس نظم کی تخلیق سے کچھ ہی دنوں بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں اپنی مکمل عریانی کے ساتھ شاہراہِ عام پر ایک ایسے تماشے کے روپ میں نظر آئیں گی جنھیں انسانی تاریخ صدیوں تک فراموش نہ کر سکے گی۔

وہاں سہمی ہوئی ٹھٹھری ہوئی راتوں نے دیکھے ہیں
دریدہ پیرہن، عصمت نگوں سر، بال آوارہ
گریباں چاک، سینہ وا، بدن لرزاں، نظر تیرہ
خمِ ابرو میں درماندہ جوانی محوِ نظارہ

کہیں روتے بھٹکتے پھر رہے ہیں ہر طرف، ہر سو
غلاظت آشنا، جھلسے ہوئے انسان کے پلّے
یہ وہ ہیں جو نہ ہوتے کوکھ پھٹ جاتی مشیت کی
تمناؤں میں ان کی رات دن کھینچے گئے چلّے

نظم کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے:۔

غرض اک دور آتا ہے، کبھی اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں
مرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں
میں تو شہ ہوں نہ راہی ہوں، نہ منزل ہوں نہ جادہ ہوں

انسانوں کو جو نسل دو اندھیروں کے درمیان کھڑی ہو اس کا شاعر اگر حساس اور غیور ہے اور اس میں حقیقت سے آنکھیں چرانے کا رجحان نہیں تو اس کے ہاں شکست تنہائی، حزن و یاس اور موت و حیات کی کشمکش سے پیدا ہونے والی ہیبت ناک پرچھائیاں لازمی ہیں۔ فراری ذہنیت ان مناظر کی تاب نہیں لا سکتی اس لئے چند جھوٹے سچے رومانی خوابوں کا ہالہ بنا کر اس میں پناہ لیتی ہے۔ اخترالایمان نے انسانی تہذیب کے اس المیے کو بڑے کرب کے ساتھ محسوس کیا ہے اور اپنے کرب کو کہیں چھپایا نہیں ہے۔ نظم "تنہائی" میں ایک جگہ یہ منظر ہے۔

اک دھندلکا سا ہے دم توڑ چکا ہے سورج
شب کے دامن پہ ہیں دھبّے سے سیہ کاری کے
اور مغرب کی فنا گاہ میں پھیلا ہوا خون
دبتا جاتا ہے سیاہی کی تہوں کے نیچے

اور ایک جگہ یہ شدید ردِ عمل بھی:۔

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
اُن کے قدموں پہ مچلتا ہو دمکتا ہوا خون

لیکن یہی نظم جو تنہائی کے احساسات سے ابھرتی ہے آگے چل کر بعض بنیادی حقائق کی جستجو پر ختم ہوتی ہے۔ اس نظم میں "تالاب" اس انسانی معاشرے کی علامت ہے جہاں پانی ایک جگہ پڑا پڑا سڑنے لگا ہے، جس میں جمود اور تعطل ہے، اور اس سڑے ہوئے پانی نے طرح طرح کے جراثیم کو جنم دیا ہے۔ اسی طرح "بول" وہ فرد ہے جو

تنہا ہے۔ سماج اس کی شخصیت کے لئے کسی طرح معاون نہیں۔

ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے وہ بول
سوچتی ہو گی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
آئینہ بن کے شب و روز تکا کرتا ہے
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا

اخترالایمان کے یہاں تنہائی کا احساس سماج کے بالمقابل فرد کی شکست یا پسپائی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان متحرک اور صحت مند عناصر کی نمود کی وجہ سے ہے جو ایک نئے معاشرے کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ اس لئے یہ عناصر جب مرکزیت حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے شعور میں ایک ایسی قوت محسوس کرتے ہیں جو پرانی فصیل کو منہدم ہوتے اور فرسودہ سماج کو دم توڑتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں۔ نظم "موت" میں اس جانکنی کو بڑی ڈرامائی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کا بنیادی کردار" میں" اس نظام کہنہ کی علامت ہے جو موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اس کی نظروں کے سامنے اس کا آخری انجام ہے۔

زلزلہ، اف یہ دھماکہ، یہ مسلسل دستک
کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
اُف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت
کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

اخترالایمان کی ابتدائی نظموں میں تاریکی اور روشنی کا یہی رزم نامہ ہے۔ اک تصادم اور پیکار کا جیسا پر جلال احساس "گرداب" کی شاعری میں ابھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس سے ان کے معاصرین کی شاعری خالی ہے۔ اس المیہ نے اسے اپنی ذات کے خول سے نکال کر اس کی شخصیت کی توسیع کی ہے۔ وہ اپنے تجربات ومشاہدات اور اپنے داخلی محسوسات کو خارجی حقیقتوں سے ٹکراتا، ان سے مربوط کرتا اور ایسے حقائق دریافت کرتا ہے جو پوری انسانی زندگی پر محیط ہیں۔ "جواری" اور "پگڈنڈی" اس اعتبار سے کامیاب فکری نظمیں ہیں۔

اختر الایمان کے یہاں بعض مناظرِ حیات پر سوالیہ نشان قائم کرنے کا میلان قدم قدم پر ملتا ہے:۔

کیا جانے یہ اندھی بازی کس نے جیتی کس نے ہاری؟
کیا جانے کیوں سانجھ سویرے آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں

(جواری)

کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
تاریکی آغازِ سحر ہے، تاریکی انجام نہیں ہے
آنے والوں کی راہوں میں کوئی نورِ آشام نہیں ہے

(پگڈنڈی)

"گرداب" میں جو نظمیں خالص احساسات اور تاثرات کے پس منظر میں ابھری ہیں ان میں استفہامیہ انداز نمایاں ہے جو اختر الایمان کے مخصوص مزاج کی نمائندگی کرتا ہے:۔

یہ رہروانِ زندگی خبر نہیں کدھر گئے
وہ کون سا جہان ہے ازل نہیں ابد نہیں
دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب
یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں

(نقش پا)

ایک دوراہے پہ حیران ہوں کس سمت بڑھوں
اپنی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوں شاید
میں بھی گردش گہہ ایام کا زندانی ہوں
درد ہی درد ہوں فریاد نہیں ہوں شاید

(محرومی)

سوچ میں ڈوب گئے راہ گزر کے خم و پیچ
کون اب آئے گا امید کے ویرانے میں؟

(فیصلہ)

ٹوٹے پھوٹے جام پڑے ہیں، سونی سونی ہے کچھ محفل
دھوپ سی ڈھل کر بیت گئی ہے ساقی کی مجبور جوانی
کیا جانے کب سورج نکلے، بستی جاگے، غم مٹ جائیں

(نئی صبح)

کوئی دروازے پر دستک ہے نہ قدموں کے نشاں
چند پر ہول سے اسرار تہہِ سایۂ در
خود ہی سرگوشیاں کرتے ہیں کوئی جیسے کہے
پھر پلٹ آئے یہ کمبخت وہی شام وسحر؟

(زندگی کے دروازے پر)

کس قدر تیزی سے یہ باتیں پرانی ہو گئیں؟

(لغزش)

"گرداب" کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر کے یہاں ایک شدید تناؤ کی کیفیت ہے۔ ایک قسم کا کرب جو داخلی اور خارجی حقائق کے ٹکراؤ سے پیدا ہوا ہے۔ ایک ایسی جستجو جسے کسی منزل پر قرار نہیں۔ ایک گرہ کھلتی ہے تو دوسری گرہ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ "تاریک سیارہ" کی بعض نظموں تک جاتا ہے۔" "تاریک سیارہ" ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا لیکن اس کی بعض نظمیں اسی دور کی ہیں جب "گرداب" کا شاعر ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا۔ چنانچہ "تاریک سیارہ" اور "خاک وخون" بھی اسی طرح کی ڈرامائی نظمیں ہیں جو کیفیات کے تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔ "تاریک سیارہ" میں خواب اور حقیقت کا ٹکراؤ ہے۔ "خاک وخون" میں جن کرداروں کے مکالمے ہیں وہ "قوت نمو" اور "راہی" کے سمبل ہیں۔ فرد کی جس قوت نمو نے اختر الایمان کی نظم "موت" میں نظام کہنہ کو دم توڑتے دیکھا تھا وہ اب واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ اس نظم پر شاعر نے جو نوٹ دیا ہے اس سے اس کے ذہنی رویئے پر روشنی پڑتی ہے۔

"تاریک سیارے کے ہر تودۂ خاک میں اس بہار آفریں مستقبل کی قوتِ نمو ہے جو نئی انسانیت کی تمہید بن سکتی ہے۔"

بعض دوسری نظموں میں بھی یہ کشمکش، استفہامیہ انداز اور جستجو کا عمل جاری ہے۔

اسی لئے کیا اگا کریں گے
یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلا دیں

(ایک سوال)

میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے
خزاں بدوش بہار و خمارِ زہر آلود

(ریت کے محل)

تاروں کے سہارے چل رہے تھے
سورج کی تلاش میں تھے راہی

(جب آنکھ کھلی تو....)

دہقان سنوارتا ہے مٹی
چن چن کے بکھیرتا ہے دانے
اور سوچتا جا رہا ہے جی میں
پھر آئے گی جنگ آزمانے؟

(جنگ)

سوچ لوں باز کروں ورنہ کروں
شیشہ و سنگ کی جھنکار سنوں
آج کیا کہتے ہیں غم خوار سنوں

اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا (دستک)

لیکن "تاریک سیارہ" کی بعض نظموں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی نئی آواز سن رہے ہوں۔ ان نظموں میں طرزِ فکر، اسلوب اور لب و لہجے کے اعتبار سے ہمیں ایک نئی فضا اور نیا آہنگ ملتا ہے جو "گرداب" اور "تاریک سیارہ" کی بعض دوسری نظموں سے مختلف ہے۔ ان نظموں میں تناؤ اور شدت کے بجائے ایک طرح کی آسودگی اور حلاوت کا احساس ہوتا ہے۔ اختر الایمان کے یہاں یہ تبدیلی کیوں پیدا ہوئی۔ اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیا جس دور میں انھوں نے یہ نظمیں لکھیں وہ پہلے دور سے کیسر مختلف تھا؟ یہ بات زیادہ قرین قیاس نہیں۔ اس لئے کہ بعض جزوی تبدیلیوں سے قطع نظر آج کے انسان کو بھی وہی مسائل درپیش ہیں اور ہمارے معاشرے میں وہی روحانی، اخلاقی اور نفسیاتی کشمکش جاری ہے جو پہلے تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانے میں اختر الایمان کی شخصیت کا ارتفاع ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اس منزل پر آکر وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے جسے 'گیان' کہتے ہیں۔ انھیں زندگی کا وہ عرفان حاصل ہو گیا ہے جو طبیعت میں توازن، نرمی و بردباری اور لہجے میں مٹھاس اور رمانویت پیدا کرتا ہے۔ اختر الایمان کی نظموں میں جو مخصوص طرز اور لہجہ ابھرا ہے اور جس نے ان کی نظموں کو ایسی انفرادیت بخشی ہے جو دور سے پہچانی جاتی ہے۔ اس کی ابتدا "تاریک سیارہ" کی انھیں نظموں سے ہوتی ہے۔ ایسی نظموں میں "تبدیلی"، "اتفاق"، "عہد وفا"، "سرِ رہگذارے"، "اندوختہ"، "محبت"، "واپسی" اور "یوں نہ کہو" خاص طور پر لائقِ توجہ ہیں۔ "تاریک سیارہ" کی ان نظموں پر ("جو آج کل" اور "یادیں" میں شامل ہیں اور جن کا سلسلہ "بنت لمحات" تک کی نظموں تک جاتا ہے) اختر الایمان کے مخصوص طرز کی چھاپ ہے۔ ان نظموں میں جہاں ایک طرف تازگی اور ندرت، تہہ داری اور گہرائی ہے وہاں ایسی سادگی اور بے ساختگی ہے جو پڑھنے والوں کو اپنے بہت قریب کر لیتی ہے۔ ان میں علامتی شاعری کی معنویت اور ہمہ گیری بھی ہے اور براہ راست شاعری کی وضاحت، صفائی اور عمومی اپیل بھی۔ ان نظموں میں اختر الایمان نے اظہار و اسلوب کے جو پیرائے دریافت کئے ہیں ان سے جدید اردو نظم میں کئی سمتیں پیدا ہوئی ہیں اور اس کے امکانات میں بیش قیمت اور خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کے فروغ اور حلقۂ اربابِ ذوق کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں جدید نظم کا تصور ابھرتا ہے۔ جدید انگریزی اور فرانسیسی شاعری سے استفادہ کر کے ہمارے شعرا نے نظم نگاری میں جو اجتہادات کئے ان میں بعض ناکام رہے اور بعض کامیاب اور اس قدر کامیاب کہ اردو نثر کے عام قاری نے آہستہ آہستہ ان سے موانست حاصل کر لی لیکن اپنی ساری جدیدیت کے باوجود اردو نظم پر بھی روایات بالخصوص غزل اور

قصیدے کی شاعری کا سایہ ہے۔ ہماری آزاد اور معری نظمیں بھی اس فضا اور آہنگ سے باہر نکل نہیں پاتیں جو فارسی اور اردو غزل سے مخصوص ہے گو ہم نے قافیے کی سخت گیری سے نجات حاصل کرلی ہے اور اس کے تابع ہونے کے بجائے خود اسے اپنے تابع کرنے کی کوشش کی ہے، کچھ نئے علائم و رموز دریافت کئے ہیں، کچھ نئی تشبیہات، ترکیبیں اور ذہنی تصویریں بنائی ہیں لیکن مجموعی طور پر ہماری نظم کے مزاج پر غزلیہ رنگ اور عجمی انداز غالب ہے۔ فیض، راشد اور ان کے پیروؤں کے یہاں یہ بات بطور خاص محسوس کی جاسکتی ہے۔ البتہ میرا جی نے اس بات کی کوشش ضرور کی تھی کہ اردو نظم کو نہ صرف ظاہری ہیئت کے اعتبار سے بدلا جائے بلکہ اس کے اندرونی مزاج اور اس کی بنیادی ساخت میں تبدیلی کی جائے۔ میرا جی کی شاعری کے چاہے ہم قائل ہوں یا نہ قائل ہوں لیکن یہ بات ماننی پڑیگی کہ انھوں نے اردو نظم کو ہندوستانی مزاج دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں ایک تو انھوں نے اسی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے جس کی بنیاد عظمت اللہ خاں نے اپنی نظموں میں ڈالی تھی یعنی ایسی زبان کا استعمال جو غزل سے مختلف ہو اور ایسی فضا کی تخلیق جس میں ہندوستانی ماحول، ہندوستانی روایات و اساطیر اور اپنی زمین سے قربت کا احساس ہو۔ عظمت اللہ خاں نے ایسی نظموں میں عوامی گیتوں اور کلاسیکی موسیقی کے بولوں سے فائدہ اٹھاکر اپنی نظموں کو ایک نیا لہجہ دیا تھا۔ میرا جی کی پابند اور معری نظمیں زیادہ تر اسی اسلوب میں ہیں۔ دوسری کوشش ان کی یہ تھی کہ آزاد نظم اور علامتی شاعری میں مغرب کی روایات سے استفادہ کرتے ہوئے بھی اسے ہندوستانی معاشرہ اور ماحول سے بہت قریب رکھا جائے۔ اس کے لئے نظموں میں جو زبان استعمال کی جائے وہ بول چال اور نثر کی فطری زبان سے زیادہ قریب ہو۔ میرا جی نے اپنی نظموں میں یہ زبان استعمال بھی کی لیکن اس زبان کی توانائی، اس کا حسن اور اس کی معنی خیزی ان کی نظموں میں اپنا جادو نہ جگاسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا جی نے اپنی شاعری کے لئے جو موضوعات منتخب کئے تھے اور وہ لاشعور اور تحت الشعور کی جن گتھیوں کو سلجھانا چاہتے تھے وہ ان کی نظموں میں تخلیقی پیکر اختیار نہیں کرپائیں۔ ان کے تجربات بیشتر ذہنی معلوم ہوتے ہیں اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انکے شعری وجدان کا جزو نہیں بن سکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظمیں عام طور پر بکھری بکھری سی ہیں۔ ان میں نقطۂ عروج اور بھرپور خاتمے کا احساس نہیں ہوتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں کچھ پرچھائیاں ہیں جو آپس میں گڈمڈ ہوگئی ہیں اور وہ سب کو پکڑنے کی کوشش میں وہ خود بھی ذہنی طور پر الجھتے جارہے ہیں کہیں کہیں ایسے ٹکڑے ضرور ملتے ہیں جن میں تخلیقی کرب کروٹیں لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی نظمیں پھر دھندلکوں میں کھو

جاتی ہیں۔ میرا جی بہت ذہین آدمی تھے۔ انھوں نے مغرب اور مشرق کی شاعری کا بڑی لگن کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ جدید نظم کا اتنا اچھا مزاج شناس اور پارکھ کوئی دوسرا شخص اس زمانے میں پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اپنے بعض ہمعصر شعرا کی نظموں کا جس طرح تجزیہ کیا ہے اور ان کی معنویت جس پیرایے میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کی تخلیقی شخصیت ادھوری سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کی ایک افسانوی شخصیت بھی ہیں اور ان کے کردار کے ارد گرد کچھ ایسی حکایتیں ہیں جن کے سبب ممکن ہے ان کی نظموں سے آئندہ بھی دلچسپی لی جائے اور ان کے معانی و مفاہیم اور ان کے جنسی رویے کو دریافت کرنے کا عمل جاری رہے لیکن عام قاری کے لئے ان کا کلام پڑھنا آج بھی ایک صبر آزما کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرا جی کی نظموں کی سب سے زیادہ افادیت یہ ہے کہ انھوں نے اسلوب و اظہار کی جو راہیں نکالی تھیں ان سے مثبت اور تخلیقی طور پر استفادہ کیا جائے۔ ان کے ہمعصروں میں جن شعرا نے سلیقے کے ساتھ اس روایت کو آگے بڑھایا ہے، ان میں مختار صدیقی اور مجید امجد اور اختر الایمان کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ لوگ میرا جی کے مقلد نہیں ہیں بلکہ انھوں نے میرا جی کے ناتمام اور ناتراشیدہ تجربوں کو ایک نئی معنویت کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان شعرا نے میرا جی کے اسلوب کے بعض عناصر اپنی شخصیت اور مزاج کے دوسرے عناصر سے آمیز کرکے ایک نئی اور منفرد شکل دی ہے اور اپنے اسلوب کو اس قدر علیحدہ کرلیا ہے کہ وہ ان کی اپنی چیز بن گیا ہے۔

اختر الایمان کا انفرادی طرز اور ان کی اپنی آواز جہاں سے صاف سنائی دیتی ہے وہ "تاریک سیارہ" کی ایسی نظمیں ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ طرز بھی مسلسل نشوونما کے عمل سے گزرتا رہا ہے اور موضوعات و مشاہدات اور جذبات و کیفیات کے اعتبار سے ان میں ایک منفرد لہجے کے باوجود ایسا تنوع ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اختر الایمان اپنے طرز یا اسلوب کے اسیر نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے یہاں چند الفاظ تراکیب یا چند علامتوں کی تکرار ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہر نظم ان کے لئے اسلوب و اظہار کے اعتبار سے ایک دریافت کی حیثیت رکھتی ہے بعض نظموں میں سادہ اور بول چال کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ ان میں جو منظر یا ذہنی تصویر ابھاری گئی ہے وہ پیش افتادہ اور سامنے کی ہے لیکن اسے جو علامتی معنویت دی گئی ہے اس سے نظم میں تہہ داری اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے اور نظم کا تاثر ہمارے سامنے کچھ ایسے دریچے کھول دیتا ہے جس سے ہم ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ بعض ایسے حقائق جن سے ہم آئے دن دوچار ہوتے ہیں لیکن نظم کے اندر انھیں ایسے مناظر اور ایسے تجزیے کے ساتھ

دیکھتے ہیں جن سے ہماری مسرت میں اضافہ ہوتا ہے اور ہمیں یہ نظم ایک حیرت انگیز انکشاف معلوم ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "تبدیلی"، دیکھئے جو صنعتی دور میں ایک فرد کی تنہائی کا ردِ عمل ہے:۔

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے او بے او سر پھرے
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گالیاں دیں، ہنسیں ہاتھا پائی کریں
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں ایک دوسرے کی سنیں اور کہیں
اور اس نیک روحوں کے بازار میں
میری یہ قیمتی بے بہا زندگی
ایک دن کے لیے اپنا رخ موڑ لے

اسی طرح "عہدِ وفا"، کے نام سے جو مختصر نظم ہے وہ معنی و مفہوم کی ان گنت سمتیں بھی رکھتی ہے اور بظاہر ایک سادہ سی کہانی ہے جو قریب قریب نثر کی زبان اور نثر کے سے آہنگ میں بیان کی گئی ہے۔ یہ نظم پابند ہے لیکن اس میں مصرعوں کی ساخت اور مصرعوں کی ترکیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ شاید آزاد نظم میں بھی یہ بےساختگی مشکل سے پیدا کی جاسکے۔ یہ نظم تکنیک اسلوب اور فنی طریق کار کے اعتبار سے ایک کامیاب تجربہ اور جدید اردو نظم کی روایت میں ایک اجتہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لئے چشم نم ہو اب سے کچھ سال پہلے
مجھے ایک چھوٹی سی بچی ملی تھی جسے میں نے آغوش میں لے کے پوچھا تھا بیٹی!
یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو؟ مجھے اپنے بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر
وہ کہنے لگی میرا ساتھی، ادھر، اس نے انگلی اٹھا کر بتایا، ادھر اس طرف ہی
جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں، آسماں کی طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں
یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے لینے جاتا ہوں رامی!

اختر الایمان نے اپنی طویل اور مختصر دونوں طرح کی نظموں میں یہ خصوصیت برتی ہے کہ وہ ایسی عام فہم، واضح اور شفاف ہوں اور ان کو ایسے پس منظر میں ابھارا جائے کہ ان سے ایک عام قاری بھی حسب توفیق لطف اندوز ہو سکے، اسے وہ جمالیاتی مسرت، نازک احساسات کی باز آفرینی اور اپنے دل کی آواز مل سکے جس کا وہ ہر سچی شاعری سے متوقع ہوتا ہے۔ دوسری طرف ان میں ایسی رمزیت اور بلاغت ہو کہ وہ اپنے دور کی ہمہ گیر حقیقتوں اور وسیع تر صداقتوں کا احاطہ کر سکے۔ اس اعتبار سے ان کی دو نظمیں "ایک لڑکا" اور "یادیں" نہ صرف ان کا شاہکار کہی جا سکتی ہیں بلکہ ان نظموں میں جو دلکشی اور تازگی، جو گہرائی و گیرائی اور فنی پختگی کے ساتھ تاثیر کا عنصر ہے۔ وہ بہت دنوں تک جدید اردو نظم کی تاریخ میں اپنا جواب طلب کرتا رہے گا۔ اختر الایمان نے کس سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ اپنی شاعری کے "میں" کو اپنے عہد کے انسان کی علامت بنا دیا ہے وہ ان دونوں نظموں میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

اختر الایمان نے کوشش کی ہے کہ نظم کی زبان اور اس کا ذخیرہ الفاظ موضوع کی مناسبت سے متنوع ہو لیکن مواد اور پیرایۂ بیان اس طرح ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں کہ پوری نظم ایک اکائی کی صورت میں ہمارے سامنے ہو۔ اس میں الفاظ، تراکیب، تشبیہات، استعارے اور تمام ذہنی تصویریں اس طرح ابھرتی چلی آئیں جیسے وہ مواد اور پیرایۂ بیان کا ایک لازمی جزو ہیں۔ انھوں نے نظم کی وحدت اور فنی تکمیل پر خاص طور سے توجہ دی ہے اور اس کے لئے ریاض کیا ہے۔ انھوں نے نظم کو تکرار خیال یا مسلسل غزل کے پیرائے سے نکال کر ایک ایسی صورت دینے کی کوشش کی ہے جس سے نظم کا لطف اس کے ٹکڑوں، بندوں، مصرعوں یا تشبیہوں اور ترکیبوں میں تقسیم نہ ہو۔ ان سارے اجزا کی معنویت اسی وقت صحیح طور پر سامنے آئے جب وہ نظم میں اپنی مناسب جگہ پر ہوں اور پوری نظم سے اس طرح وابستہ ہوں جس طرح ایک اینٹ کسی عمارت سے۔ ممکن ہے اس عمل میں انھیں ہر جگہ ایک سی کامیابی نصیب نہ ہوئی ہو لیکن ان کی بیشتر نظموں میں یہ معیار برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اختر الایمان کے شعری طریق کار کے سلسلے میں ایک اور بات خاص طور پر لائق توجہ ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے خارجی مشاہدات و تجربات کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور داخلی واردات اور ذاتی کیفیات کو بھی لیکن دونوں طرح کے موضوعات نے جو تخلیقی پیکر اختیار کیا ہے وہ اپنے رنگ و آہنگ، لب و لہجہ اور اثر و تاثیر کے اعتبار سے ایک جیسا ہے۔ وہ خارجی مشاہدات و تجربات کو اسی وقت نظم کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کرتے

ہیں جب وہ ان کے داخلی محسوسات، ان کے شعری وجدان اور تخلیقی شخصیت سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ ذاتی تجربات اور داخلی محسوسات کو جوں کا توں پیش کر دینے کے بجائے اسے خارجی زندگی کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور اس کی اس طرح تقیم کرتے ہیں کہ ان میں ایک ہمہ گیری اور سماجی معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ اختر الایمان کی نظمیں ایک طرف سچی اور پر خلوص شاعری کا نمونہ ہیں تو دوسری طرف اپنے دور کے عمومی احساسات وارتعاش کی کامیاب مصوری۔ انھوں نے صحافتی انداز کی خارجی اور مسائلی شاعری سے دامن بچا کر جہاں بلیغ، تہہ دار موثر اور دیرپا کیفیات کی حامل نظمیں لکھی ہیں۔ وہاں سماجی زندگی کی بصیرت حاصل کرنے اور اس بصیرت کو اپنے ادراک شعری کا جز بنانے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کی نظموں کے سلسلے میں لہجے کی کشادگی حلاوت اور مانوسیت کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ انداز دراصل اس اعتماد سے پیدا ہوا ہے جو انھیں انسان پر ہے۔ زندگی کا گیان حاصل ہو جانے کے بعد ان کے یہاں حزن و یاس، تشکیک اور احساس نارسائی کے بجائے زندگی کو قبول کرنے، اس کے اونچ نیچ اور سرد و گرم کو گوارا کرنے، اس کے زہر کو ہضم کر کے امرت بنانے کا ہنر آیا ہے۔ ان کے دل میں اب اس دھرتی کے لئے پیار ہے (یہ دامنِ عشق رفتگاں ہے زمیں کو نفرت سے یوں نہ روندو) اور اپنے ہم جنسوں کے لئے یہ جذبہ کہ:۔

برے بھلے یہی سب لوگ اپنی دنیا ہیں
نقیبِ صبحِ بہاراں انھیں کی خیر منائیں
انھیں کو ساتھ لئے ان کے ساتھ بڑھتے چلیں
انھیں سے رونقِ بزمِ جہاں کا امکاں ہے

انسان دوستی اور انسان پرستی کا عقیدہ ہماری شاعری میں پہلے بھی رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن اختر الایمان ان شاعروں میں ہیں جن کے یہاں یہ محض عقیدہ نہیں بلکہ ان کی اپنی زندگی کا مسئلہ ہے انھوں نے انسان کو دیکھا اور برتا ہے، ایک عام آدمی کی طرح زندگی کا دکھ درد جھیلا ہے اور اپنے طور پر حیات و کائنات کی سچائیوں کو دریافت کیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ کسی منزل پر رکے نہیں۔ وہ سنہ ۱۹۴۴ء میں بھی نئے شاعر تھے اور آج سنہ ۱۹۶۴ء میں بھی نئے شاعر ہیں جب کہ اس بیس سال کے عرصے میں جشن اور جلوس کے ساتھ آنے والے بہت سے شاعر اپنی شاعری سے ایسے پشیمان ہوئے کہ انھوں نے اپنا بستہ ہمیشہ کے لئے باندھ کر رکھ دیا اور آج کا قاری ان پر رائے دینے کے بجائے

کہتا ہے کہ یہ تو بعد میں طے ہوگا کہ وہ قدیم شاعر تھے یا جدید شاعر، ترقی پسند تھے یا رجعت پسند، سب سے پہلے یہ طے ہو جائے کہ وہ شاعر بھی تھے یا نہیں؟ شعر و ادب کے کھرے کھوٹے کی پرکھ صحیح معنوں میں وقت کرتا ہے۔ اختر الایمان اپنی نسل کے ان دو چار شاعروں میں ہیں جنھوں نے وقت کے چیلنج کو قبول کیا ہے۔

فراق گورکھپوری

کچھ غریبوں کا بھلا کیجیے گا
یا فقط جور و جفا کیجیے گا

میں تو بس اہلِ رضا ہوں، کب تک
مجھ سے ناراض رہا کیجیے گا

دلِ بیتاب کو ممکن ہو تو آپ
اپنی اک برقِ ادا کیجیے گا

میں خود اپنی ہی قسم ہو جاؤں
مجھ کو اس طرح فنا کیجیے گا

دل کو گلزارِ رُخِ رنگیں کا
دامنِ موجِ صبا کیجیے گا

بے تعلق کوئی اتنا بھی نہ ہو
مجھ کو کیا اپنی بلا کیجیے گا

رُخِ روشن پہ یہ گیسو کی لٹک
کفر کو قبلہ نما کیجیے گا

دل کہ سرشارِ مئے غفلت ہے
اس کو ہشیار ذرا کیجیے گا

حضرتِ عشق مجھے ہے معلوم
آپ ہر بُت کو خدا کیجیے گا

دوستوں سے بھی نہیں ملتی آنکھ
کیا مجھے اپنی حیا کیجیے گا

دوستو حال مرا، میرے بعد
اک کہانی سی کہا کیجیے گا

خود سری حسن کی فطرت ہی سہی
کبھی میرا بھی کہا کیجیے گا

کون اپنا ہے زمانے میں فراق
یہ تو سنسار ہے کیا کیجیے گا

شاد عارفی

مشکل سے اُس بُت کی قسمیں — ڈو سچی ہوتی ہیں، دس میں
کاش مرا دل ہوتا بس میں — ورنہ اس محفل کی رسمیں!!
اُس کافر پر آئی جوانی — اور جوانی کس کے بس میں
ان پہروں سے! کیا ہوتا ہے — پھول نہیں کانٹوں کے بس میں
وعدے پر مجبور نہیں تم — کیوں کھاتے ہو جھوٹی قسمیں
اک بھینی بے نام سی خوشبو — شامل ہے ہونٹوں کے رس میں
خنجر سے شمشیر بنے گا — وہ ظالم دو چار برس میں
لڑنے کا الزام نہ دیجئے — ملتی ہیں نظریں آپس میں
قسمت کے دونوں پہلو ہیں — صحنِ چمن میں کنجِ قفس میں
سہل نہیں دلچسپی لینا — ہر بے بس میں ہر بے کس میں
وقت اُنھیں جھٹلا دیتا ہے — سب کھاتے ہیں سچی قسمیں

شادؔ بڑے شاعر کھاتے ہیں
اُس کا جھوٹا، اُس کی قسمیں

ڈاکٹر سمپورنا نند آنند

دلیلِ ہستیٔ کُل ہے وجودِ لازیاں میرا
عبادت خود فراموشی، خدا بارِ گراں میرا
جہاں ہندو مسلماں ہے، مسلماں شرک کا قائل
نہ کعبہ ہے نہ بُت خانہ، وہیں ہے آستاں میرا
اَنا الحق کے سُروں پر ہی جہاں کلیاں چٹکتی ہیں
اسی گلشن کے پتوں میں بسا ہے آشیاں میرا
نیاز و ناز کے چرچے مرے افسانے ہیں لیکن
کتابوں میں ملا کرتا نہیں نام و نشاں میرا
شکایت اور ہیں، کس سے کروں کس کی کروں کیسے
وہی گل ہے وہی گلچیں وہی ہے باغباں میرا
درِ مرشد کی خاکِ پاک کی عظمت کو کیا کہیے
فرشتوں کے ترانوں میں بھی رہتا ہے بیاں میرا
مصائب آتے رہتے ہیں مگر میں یہ بھی سمجھتا ہوں
کہ ان کی اہلیت کیا ہے کریں گے امتحاں میرا
نہیں یہ بادہ نوشی، ہے مئے آنند کا پینا
لیے ہے لبریز پیمانہ، ہے ساقی مہرباں میرا

سردار جعفری

خوگرِ روئے خوش جمال ہیں ہم
نازپروردۂ وصال ہیں ہم

ہم کو یوں رائیگاں نہ کر دُنیا
حاصلِ فصلِ ماہ و سال ہیں ہم

رنگ ہی رنگ، خوشبو ہی خوشبو
گردشِ ساغرِ خیال ہیں ہم

رونقِ کاروبارِ ہستی ہیں
ہم نے مانا شکستہ حال ہیں ہم

مال و زر، مال و زر کی قیمت کیا
صاحبِ دولتِ کمال ہیں ہم

کس کی رعنائی خیال تو ہے
تیری رعنائی جمال ہیں ہم

دولتِ حسن لازوال تو ہے
دولتِ عشق لازوال ہیں ہم

منیر نیازی

یہ آنکھ کیوں ہے یہ ہاتھ کیا ہے
یہ دن ہے کیا چیز رات کیا ہے
فراقِ خورشید و ماہ کیوں ہے
یہ اُن کا اور میرا ساتھ کیا ہے
گماں ہے کیا اُس صنم کدے پر
خیالِ مرگ و حیات کیا ہے
فغاں ہے کس کے لئے دلوں میں
خروشِ دریائے ذات کیا ہے
فلک ہے کیوں قیدِ مستقل میں
زمیں پہ حرفِ نجات کیا ہے
ہے کون کس کے لئے پریشاں
بتا تو دے اصل بات کیا ہے
ہے لمس کیوں رائیگاں ہمیشہ
فنا میں خوفِ ثبات کیا ہے
منیرؔ اس شہرِ غم زدہ پر
ترا یہ سحرِ نشاط کیا ہے

مظفر حنفی

حالانکہ محتسب سے سبھی پی نہ جائے گی
مے پھر بھی بوند بوند ہمیں دی نہ جائے گی

ہم سوچنے لگے ہیں کہ پینا ہی چھوڑ دیں
طے ہے کہ بدمزاجیٔ ساقی نہ جائے گی

جی چاہتا ہے اس کو لگاتار دیکھئے
پھر بار بار تو یہ خطا کی نہ جائے گی

دنیا کو آپ میری نظر سے نہ دیکھئے
میں عرض کر چکا ہوں کہ دیکھی نہ جائے گی

وہ مائلِ عتاب ہے ہر بے گناہ پر
اپنی خطا پہ اس کی نظر ہی نہ جائے گی

اس بار اور ہی ہے ارادہ بہار کا
یعنی چمن میں اس کی بلا بھی نہ جائے گی

نیند آئے گی نہ "شاعرِ رجعت پسند" کو
جب تک کسی کی زلف بکھیری نہ جائے گی

تم نے ہر ایک پھول پہ پہرے بٹھا دیئے
لیکن نسیمِ صبح تو باندھی نہ جائے گی

دنیا بھی تلخ تر ہے مظفر کے واسطے
اس کی غزل سے طنز کی تلخی نہ جائے گی

ساحر ہوشیارپوری

آبروئے حسن عشقِ معتبر کے ساتھ ہے
مبتدا گویا محبت کا خبر کے ساتھ ہے

زندگی بے کیف ہو جائے جو کوئی غم نہ ہو
لطفِ دنیا انبساطِ غم اثر کے ساتھ ہے

ہائے کس امید پر اب عزمِ منزل کیجئے
راہزن کا ہر قدم تو راہبر کے ساتھ ہے

آرزو کی موت، پھر اک آرزو، پھر اس کی موت
یہ قیامت زندگی بھر ہر بشر کے ساتھ ہے

حسن سادہ ہیں خود اپنا رنگ بھر دیتا ہے عشق
کیفِ نظارہ مرے حسنِ نظر کے ساتھ ہے

زلف و رخ سے کھیلنا ہر دم ہے اپنا مشغلہ
چھیڑ اپنی گردشِ شام و سحر کے ساتھ ہے

راہ کی دشواریوں سے کیا خطر ساحر ہمیں
ہر قدم ہر نقشِ پائے راہبر کے ساتھ ہے

رسا جاودانی

وہ رشکِ قمر آج سرِ شام نہ آیا
شب بھر کسی پہلو مجھے آرام نہ آیا

تڑپا جو کئے ہم تو بڑھا ان کا تغافل
اے جذبِ دروں تو بھی کسی کام نہ آیا

دل سوختۂ عاشق پہ چلا تیرِ ملامت
کچھ حُسنِ جہاں سوز پہ الزام نہ آیا

ہم بن کے تماشا تو گئے ان کی گلی میں
وہ بہرِ تماشا بھی لبِ بام نہ آیا

اربابِ عبادت کو رسا سے یہ گلہ ہے
مسجد میں کبھی عاشقِ اصنام نہ آیا

محسن احسان

مرے وجود کے دوزخ کو سرد کر دے گا
اگر وہ ابرِ کرم ہے تو کھل کے برسے گا
گلہ نہ کر کہ ہے آغازِ شب ابھی پیارے
ڈھلے گی رات تو یہ درد اور چمکے گا
یہ شہرِ کم نظراں ہے، ادھر قدم بھی نہ رکھ
یہاں اشارۂ مژگاں کوئی نہ سمجھے گا
ہے اشتیاقِ اسیری تو میرے ساتھ نکل
کہ کوئی تو مری پروازِ شوق روئے گا
رواں تو ہوں سُوئے افلاکِ آرزو لیکن
یہ زورِ موجِ ہوا بازوؤں کو توڑے گا
میں اس بدن میں اُتر جاؤں گا نشے کی طرح
وہ ایک بار اگر پھر پلٹ کے دیکھے گا
تلاشِ قافلۂ زندگی ہے اب بے سُود
یہ رہگزارِ نفس پر کہیں تو ٹھہرے گا
نہ آنکھ میں کوئی جنبش، نہ پاؤں پر کوئی گرد
جہاں سے اتنا بھی محتاط کون گزرے گا
رہے گی دل میں نہ پھر کوئی بھی خلش محسن
حریمِ خاک میں جب چین سے تو سوئے گا

شری جگدیش پرشاد خلش

کچھ جان کے پیچھے جان نہیں، ہم جان کے پیچھے جان گئے
جس جان کی خاطر مرتے تھے، وہ جان گئی، بیجان گئے

کیوں حضرتِ دل ناحق ہیں خفا اب حق ناحق کا بھید نہیں
حق یہ ہے کہ حق کو مان لیا جب حق کو ہم پہچان گئے

محفل میں رہے محفل سے جُدا، محفل ہے الگ محفل سے الگ
وہ جان کے کبھی انجان بنے، انجان رہے، انجان گئے

کیا شان یہ اہلِ شان کی ہے، وہ شان سے تھے جب شان نہ تھی
دیکھا نہ کسی نے مڑ کر بھی اس شان سے اہلِ شان گئے

آنکھوں میں جو ہردم رہتے ہیں نظروں سے کہاں چھپ سکتے ہیں
وہ لاکھ بدل کر بھیس آئے ہر بھیس میں ہم پہچان گئے

کہنے کو زمانہ لاکھ کہے، کہنے کی ہے کوئی بات نہیں
جو ہم نے کہا وہ مان گیا جو اس نے کہا ہم مان گئے

ہستی و عدم کی محفل کا عالم ہے جدا عالم سے خلش
محفل میں رہے انجان رہے محفل سے گئے انجان گئے

خرّاٹے

شفیق الرحمٰن

اس نے خرّاٹے سُنے ـــــــ

دفعتاً چونک پڑا، جاگ اُٹھا،
لبِ نازک پہ مچلتے تھے "رسیلے نغمے"
اور بیوی تھی کہ خوابیدہ تھی
فربھی تھی کہ جوانی کا سہارا لے کر
تہہ بہ تہہ جسم پہ اس طرح جمی جاتی تھی
جس طرح کیک کرسمس کا ہو

اس نے خرّاٹے سُنے ـــــــ

مٹھیاں بھینچ کے یوں کہنے لگا
آج نیند آئی تھی دو روز کے بعد
کہ حسیں ہونٹوں کے "نغموں" نے سکوں چھین لیا
اور اب زندگی بھر دل کو نہ آئے گا قرار
کہ یہ "نغمے" کسی اندوہ مسلسل کا پتہ دیتے ہیں،
ایسے جینے پہ خدا کی پھٹکار!

اس نے خرّاٹے سُنے ـــــــ

(اپنی بیوی کی لگاتار علالت کا خیال ـ عیادت کا مسلسل بحران
کہ کسی پل بھی سکوں مل نہ سکا
اور پھر اس پہ ستم ویدوں طبیبوں کا نزول
حسن بیمار ـــــ مگر ویسا ہی بیمار رہا
جیسے صدیوں کا سماج)

اس نے خرّاٹے سے ——

اٹھا آئینے میں صورت دیکھی
آنکھ کے گرد سیہ حلقوں کو رقصاں پایا
سبزۂ خط تھا ہم آغوشِ ذقن
اپنی صورت سے ڈرا، ——
اور کیا جانئے کیا سر میں سمائی وحشت
دل میں اک عزم جواں جاگ اٹھا

اس نے خرّاٹے سُنے ——

اور کچھ سوچ کے الماری کی جانب لپکا
استرا کانپتے ہاتھوں میں لیا — کھولا — پرکھ کر دیکھا
دھار تھی تیز کسی تیغ مجاہد کی طرح
دیکھکر بیوی کے مرمرسے گلو کی جانب
اس نے آئینے میں خود پر بھی نظر دوڑائی
اور سوچا کہ یہی موقع ہے

اس نے خرّاٹے سنے ——

کمرے سے جھانک کے باہر دیکھا
اک ہمہ گیر خموشی تھی فضا پر طاری
دُور اک کتّا پڑا سوتا تھا
اس نے سوچا کہ یہی موقع ہے
—— استرا زور سے پکڑا، کانپا
اور پھر شیو بنانے لگا جلدی جلدی۔

لڑ رہی ہیں بلیّاں

شفیق الرحمٰن

لڑ رہی ہیں بلیّاں !
اُف بلیّاں

باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلیّاں !
دھند لکا ہے شام کا
وقت ہے آرام کا
کام کا
انعام کا
کا

اور لڑ رہی ہیں بلیّاں !
ہوں گی شاید چار یہ
یا تین ہوں
لیکن ذرا سا یہ شبہ، دل میں ہے میرے بڑھ گیا
کہ بلیّاں یہ پانچ ہیں
اور چھ تو ہو سکتی نہیں
اور چاندنی سی رات ہے
اور چاند ہے نکلا ہوا
اور چاندنی ہے چار سو
اور چار دن کی چاندنی
اور پھر اندھیری رات ہے

کیا کہہ رہا تھا میں بھلا
افوہ ! ابھی تو یاد تھا
اس حافظے کو کیا ہوا
کمبخت سے سمجھے خدا
ہاں مجھ کو یاد آ ہی گیا
کہ لڑ رہی ہیں بلیاں
باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلیّاں !

تبصرے

سفینہ چاہیے

از شاد عارفی مرتبہ سلطان اشرف

ناشر:- رام پور پبلشنگ سوسائٹی رام پور قیمت ۲/۷۵ روپے

اردو شاعری میں ہر رنگ کے نمونے مل جاتے ہیں۔ ایسا کچھ تو وقت کے تقاضوں اور ادبی تغیرات کے عام رجحان کا نتیجہ ہوتا ہے اور کچھ ذاتی اور انفرادی افتاد مزاج کا عکس۔ شاد عارفی کے یہاں دونوں باتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے غیر مقلد اور باغی تھے، نفسیاتی زبان میں اسے احساس برتری کی ایک شکل کہہ سکتے ہیں اور زمانہ انھیں وہ ملا جس میں روایت شکنی کی لے عام ہو رہی تھی، شعر و ادب میں طرح طرح کے تجربے کئے جارہے تھے اور شاعری کو اونچے ایوانوں سے نکال کر عام پڑھنے والوں کے ذوق کی چیز بنانے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ شاد عارفی نے اپنے لئے ایک نیا طنزیاتی رنگ سخن پیدا کر لیا۔ سفینہ چاہیے اسی رنگ کا آئینہ دار ہے۔ شاد کے یہاں طنز اور تلخی کے اسباب کی جستجو کرنے والے کو ان کی زندگی میں بہت سے ایسے عناصر ملیں گے جن سے ذہنی توازن برقرار نہیں رہ جاتا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ انھیں اپنی ناقدری کا احساس شدید تھا۔ دونوں باتوں نے مل کر انھیں سماج کی ابتری اور زبون حالی، اس کے اندرونی تضادات کی طرف متوجہ کر دیا اور انھوں نے اپنی ناکامیوں سے انتقام لینے کے لئے طنز کی راہ اختیار کی۔ طنز کی شاعری عام طور سے ہر دلعزیز نہیں ہوتی کیونکہ اُس میں جو اشارے اور کنائے ملتے ہیں، زبان کا جو اکھڑپن ہوتا ہے اور انداز بیان میں جس قسم کی تلخی پیدا ہو جاتی ہے، ان سے ہر شخص لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے شاد عارفی کو عام قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انکا انفرادی رنگ اردو شاعری کے سرمایہ میں ایک اضافہ ہے۔

اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ)

از سفارش حسین رضوی

ناشر:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی قیمت:- ۶/= روپے

مرثیہ اردو کے تین چار اہم اصناف سخن میں سے ایک ہے لیکن بدقسمتی سے اس کی ادبی اور فنی خصوصیات پر ابھی تک اس کے شایانِ شان توجہ نہیں کی گئی ہے۔ سفارش حسین رضوی نے اس حیثیت سے ایک بڑا ادبی

فریضہ انجام دیا ہے کہ اردو مرثیہ کی ایک مختصر تاریخ مرتب کردی ہے اور گو اس کا تنقیدی اور تحقیقی پہلو کمزور ہے لیکن اس اہم صنف ادب کی پوری تصویر بیک وقت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے کیونکہ سولھویں صدی عیسوی سے اس وقت تک کے مرثیہ کی نشو ونما اور ارتقار کی داستان تقریباً ساڑھے چار سو صفحات میں بیان کی گئی ہے۔ ابتدائی دور میں مرثیہ کو محض ایک صنف کی حیثیت حاصل تھی، مرثیہ نگار شعرا کم ہوتے تھے یا جو ہوتے تھے وہ اپنی غزلگوئی یا مثنوی نگاری وغیرہ کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے، مرثیہ ایک ضمنی حیثیت رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے تذکرہ نویس مرثیہ گویوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بہت سے مرثیہ گویوں کے متعلق تذکروں میں بہت مبہم اور مختصر بیانات ملتے ہیں۔ سفارش حسین نے دانہ دانہ کر کے خرمن جمع کیا ہے، جہاں کہیں بھی کسی مرثیہ نگار کے متعلق کچھ مل گیا ہے اسے یکجا کر دیا ہے۔ کتاب کی حیثیت تنقیدی اور تحقیقی کم ہے کیونکہ بعض نتائج صحیح نہیں ہیں اور محض مرثیہ گویوں کی خصوصیات کے متعلق رائیں بہت مختصر اور تشنہ ہیں۔ دور جدید کے بعض اہم مرثیہ نگاروں کے نام چھوٹ گئے ہیں اور نصف یا ربع صدیوں میں ادوار کے تقسیم کرنے کی وجہ سے بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مصنف نے بڑی جانفشانی اور علمی لگن سے یہ کام انجام دیا ہے۔ تین ساڑھے تین سو سال کے ادبی ذخیرہ کو کھنگال کر ایک خاص قسم کے شعرا کے متعلق مواد جمع کرنا، اسے صحت کے ساتھ ترتیب دینا اور ادبی انداز میں پیش کرنا بڑی بات ہے۔ مکمل طور پر نہ سہی اس حد تک مرثیہ گوئی کی تاریخ سلجھے ہوئے انداز میں بیان کر دینا بھی اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ ہے اور اس کے لئے سفارش حسین رضوی اور مکتبہ جامعہ دونوں اردو ادب کی تاریخ سے دلچسپی لینے والوں کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ چھاپے کی غلطیاں دوسرے اڈیشن میں درست ہو جائیں تو مناسب ہے۔

سید احتشام حسین

SHAHKAR
ALLAHABAD-1
Regd No. L 2005